مقالات خطیب اعظم

۲

بانی تنظیم خطیب اعظم

مولانا سید غلام عسکری طاب ثراہ

ناشر
تنظیم المکاتب، گولہ گنج، لکھنؤ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب	مقالات خطیب اعظمؒ حصہ دوم
مصنف	مولانا سید غلام عسکری طاب ثراہ
کتابت	جعفر مرزا
سنہ طباعت	بار اوّل جنوری سنہ ۲۰۰۴ء
تعداد	ایک ہزار
ناشر	تنظیم المکاتب گولہ گنج لکھنؤ
قیمت	

عرض تنظیم

بانی تنظیم خطیب اعظم مولانا سید غلام عسکری اعلی اللہ مقامہ ان باعظمت افراد میں تھے جنھوں نے حکم خدا "اپنے کو اور اپنوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ" کو عملی جامہ پہنانے کو اپنا ہدف بنالیا تھا۔ اگلی نسل کی تربیت و تعلیم ان کا مقصد حیات تھا۔ یہ کام انھوں نے اپنے پورے وجود سے کیا اور زبان و قلم کی ساری طاقت اس کے لئے صرف کی۔ ان کا کمال یہ تھا کہ جہاں وہ منبر سے پیغام حق پہنچانے کے ماہر تھے وہیں قلم کے ذریعہ مزاج دینداری پیدا کرتے رہے۔ ان کے مضامین جہاں ایک طرف دین اور ایمان کا پیغام پہنچانے میں بے نظیر ہیں وہیں دوسری طرف مذہبی اردو ادب کا شاہکار بھی ہیں۔ ان مضامین میں نہ بناوٹ ہے نہ تصنع نہ ادبی زور آزمائی اور نہ آورد بلکہ شگفتگی ہی شگفتگی ہے۔ بانی تنظیم کی وفات کے بعد ان کے چند مقالات کو جمع کر کے ادارہ سے مقالات خطیب اعظم کے نام سے طبع کیا گیا تھا۔

رفیق بانی تنظیم رئیس الواعظین مولانا سید کرار حسین صاحب مرحوم طاب ثراہ سابق سکریٹری ادارہ نے ان مقالات کے مقدمہ میں لکھا تھا کہ

"یہ وہی مقالات ہیں جنھوں نے مذہبی تاریخ کا رخ موڑا ہے دل و دماغ میں دینی انقلاب پیدا کیا ہے۔ غیر ذمہ دارانہ تحریروں اور بے سواد و بے مغز تقریروں کے بگاڑے ہوئے اور بے راہ روی کا شکار ہونے والے افراد کو اسلامی فکر عطا کی ہے۔

انداز تحریر کی سادگی، برجستگی، روزمرہ کا استعمال، سلاست اور روانی ان مقالات کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ مقالات ایسی سبیلیں ہیں جن سے دل و دماغ سیراب ہوتے ہیں۔ ہلکے پھلکے الفاظ کے دامن میں مختلف علوم کے دقیق معانی و مطالب کی ایک دنیا آباد ہے۔ ان تحریروں نے جہاں کم پڑھے لکھے سیدھے سادے عوام کو علم و عمل کی روشنی عطا کی ہے وہیں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد دانشور، ادیب، شاعر اور جدید ذہن رکھنے والے لوگوں کی سوچ کا رخ بدلا ہے۔"

مقالات کی افادیت اور مذہبی ادب کی کمی پورا کرنے کے لئے 'خطیب اعظم' جو یقیناً ادیب اعظم بھی تھے کے وہ مقالات جو تنظیم المکاتب کے علاوہ دیگر جرائد میں شائع ہوئے ہیں۔ جمع کر کے شائع کئے جا رہے ہیں تاکہ جدید نسل تک بھی یہ پیغام پہنچ سکے۔ اور جدید نسل کے صاحبان قلم کو مذہبی ادب کا نمونہ بھی مل سکے۔ ان مقالات کو اس طرح مرتب کیا گیا ہے کہ سلسلۂ تعلیم بالغان میں اردو ادب کے طور پر انھیں پڑھایا جا سکے۔ امید ہے کہ رسم و رواج سے عاجز اور اسلام محمدی کے شیدائی اہل ایمان ان مقالات سے استفادہ کریں گے۔ والسلام

سید صفی حیدر

سکریٹری تنظیم المکاتب ۱۷ر جنوری ۲۰۰۴ء

مقالات خطیب اعظم

حصّہ دوم

صفحہ	مضامین	نمبر شمار
۵	ہمارے خوف اور خوف خدا	(۱)
۹	حکومت علیؑ کا حق ہے	(۲)
۱۷	حضرت علیؑ کی حکیمانہ خاموشی	(۳)
۲۵	غدیر سے اسلامی انقلاب تک	(۴)
۲۹	مثبت تبلیغ	(۵)
۳۶	ھدی	(۶)
۴۱	امام سے قریب تر ہونے کا عمل	(۷)
۴۷	فتووں سے اختلاف کی وجہ	(۸)
۵۱	مسائل فہمی کو علمی رخ دیجئے	(۹)
۵۴	عبادت کرو۔ عبادت کو عادت نہ بناؤ	(۱۰)
۶۱	تعلیم اور ملازمت	(۱۱)
۶۵	شام زندگی کے اندھیرے اجالے	(۱۲)
۷۴	مظلوم آقاؤں کی محنتوں کو بربادی سے بچائیے	(۱۳)
۷۹	راہ تبلیغ کے شہید ابوذر غفاری	(۱۴)
۸۳	اسلامی انقلاب کے چراغ کی روشنی	(۱۵)
۸۹	سہاگ اور سوگ شریعت کی نظر میں	(۱۶)
۹۴	جو جوابی ظلم بھی نہ کرے	(۱۷)
۹۹	دامن کی خبر ہے نہ گریباں کی خبر ہے	(۱۸)
۱۰۵	ناقابل برداشت مگر سچ	(۱۹)
۱۱۱	ہماری خرابیوں کا علاج	(۲۰)
۱۱۶	فتنہ قتل سے بھی بدتر	(۲۱)
۱۲۱	قوم کی گاڑی دین کی پٹری پر	(۲۲)
۱۲۵	خدا کی پسند معیار عمل نہ کہ مقدار عمل	(۲۳)

ہمارے خوف اور خوف خدا

سماج کے حالات کا اندازہ ان ہی لوگوں کو ہوتا ہے جو سماج میں گھلے ملے رہتے ہیں۔ ملکی و قومی حالات کا اندازہ ہمیشہ ان مکالمات سے ہوتا ہے جو ریلوں میں۔ بسوں میں اور اسی طرح کے عوامی مجمعوں میں ہوتے ہیں۔ اپنی قوم میں کس طرح کے خیالات پائے جاتے ہیں۔ اس کا اندازہ بھی ان ہی افراد کو ہوتا رہتا ہے جو عوامی سطح پر لوگوں سے ملاقات کرتے رہتے ہیں۔ اس مضمون میں خوف خدا کے متعلق ہمارے سماج میں کیسے کیسے خیالات پائے جاتے ہیں ان کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔ جو فرضی نہیں ہیں بلکہ سچے واقعات ہیں۔

ایک بستی جس میں کئی ہزار مومنین آباد ہیں۔ جہاں زمینداری کی کئی نسلیں گذر چکی ہیں۔ جس کے نتیجہ میں بڑی تعداد ناخواندہ افراد کی ہے۔ اگر کچھ دنیوی تعلیم پائی بھی جاتی ہے تو دینی تعلیم سے خاندان کے خاندان بے بہرہ ہیں۔ ان ناخواندہ خاندانوں کو جہالت و غربت نے امور قبیحہ کا عادی بنا دیا تھا۔ حتیٰ کہ چوری اور ڈکیتی کرنے والے بھی پیدا ہو گئے تھے۔ رات کو مومنین مومنین ہی کے کھیت کاٹ لاتے تھے۔ اور دن میں عید کو بقرعید کو رمضان میں جس میں نماز و افطاری وغیرہ میں شرکت بھی کرتے تھے۔ البتہ جب ان سے کسی بھی کار خیر کے لئے چندہ مانگا جاتا تھا تو وہ کہتے تھے کہ ہمارے پاس حلال رقم نہیں ہے جو ہم کار خیر میں دے سکیں۔ ان کے دل میں خوف خدا کی بس یہی جگہ تھی یعنی

ہر جرم جائز تھا ۔ ہر حرام قابل استعمال تھا البتہ اللہ کی راہ میں حرام رقم نہیں لگانا چاہیئے ۔ اس کو گناہ سمجھتے تھے اور خدا سے ڈرتے تھے ۔

یہ بیچارے چونکہ جاہل اور چور کہلاتے تھے لہٰذا ان کی باتوں پر سب ہی کھل کر تنقید کرتے تھے ۔ ورنہ ہمارے سماج کے کتنے کاشتکار ۔ کلرک ۔ کاریگر افسر ۔ تاجر وغیرہ ہیں جو ناجائز آمدنی حاصل کرتے ہیں اور خرچ کرتے ہیں ۔ وارثوں کو محروم کرکے بھکاری بنا دیتے ہیں اور خود ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے ہیں ۔ اوقاف اور اداروں کو ذاتی جائداد کی طرح استعمال کرتے ہیں اور قومی شخصیت بن جاتے ہیں ۔ ان کی نگاہ میں ناجائز آمدنی ۔ حرام مال حاصل کرتے ہیں خدا سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے البتہ جو چند دینی کام وہ سال بھر میں کرتے ہیں اور وہ بھی اس لئے کرتے ہیں کہ خاندان میں اور سماج میں وہ کام کئے جاتے ہیں ۔ اگر نہ کریں گے تو نکّو بن جائیں گے ۔ ان چند دینی کاموں کے لئے وہ حلال رقم بچا کر رکھتے ہیں ۔ یعنی کھانا پینا ۔ اوڑھنا ۔ بچھونا سب حرام رہے تو خدا سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ یہ تو سب ہی کرتے ہیں ۔ البتہ جو چند دینی کام ہوتے ہیں ان میں اگر حرام رقم صرف ہو گئی تو خدا کا غضب نازل ہو جائے گا ان کے خیال میں کسی بھی نجس اور حرام چیز کے کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے ۔ البتہ قربانی کا گوشت ان کو نہ کھانا چاہیئے اس لئے کہ خدا کے نام پر ذبح ہونے والے جانور کا گوشت کا کھانا ۔ خدا کی توہین کرنا ہے ۔ جس پر خدا کا غضب نازل ہو سکتا ہے ۔ ورنہ احکام خدا کی دھجیاں اڑانے میں کوئی حرج نہیں ہے ۔ جرم و گناہ کی کثرت کے باوجود خدا سے بے خوفی کی وجہ یہ ہے کہ ایسا سب لوگ کرتے ہیں ۔ اور جہاں خدا سے ڈر جاتے ہیں اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہاں پر سب لوگ خدا سے ڈرتے ہیں ۔ یعنی مذہب کا ہمارے درمیان کوئی

علمی وجود نہیں ہے۔ صرف رواجی وجود ہے۔ اور رواج کو دین کی روشنی میں بدلنا جرم ہے کیونکہ جو کام باپ دادا کے زمانہ سے نہیں ہوا ہے۔ وہ آج کیسے ہو سکتا ہے۔ اور رواج کی حمایت کے لئے خاندان کی بزرگ عورتیں بھی مل جائیں گی۔ مسجد کے موذن بھی مل جائیں گے۔ محراب سے مولوی صاحب اور منبر سے ذاکر صاحب بھی مل جائیں گے۔ غریب دین کی حمایت کے لئے اگر کوئی ملے گا تو صرف فقیہ ملے گا۔ جو کل بھی دینی احکام کی تلاش میں سرگردان تھا اور آج بھی ہے اور وقت ظہور تک سرگرداں رہے گا۔ مگر ہم فقیہ کی تقلید نہیں کریں گے اعلم کی بات نہیں مانیں گے کیونکہ ہم تو رواج کی تقلید کرتے ہیں۔ عوام سے ڈرتے ہیں۔ خدا سے نہیں۔ دین کو ہمارا پابند ہونا چاہئے بھلا ہم دین کے پابند ہو جائیں۔

جس بستی کا ذکر تھا اسی بستی کے ایک مقدر کے چھوٹے ڈاکو بن گئے تھے۔ جو تائب ہونے کے بعد اپنے واقعات بیان کیا کرتے تھے مگر وہ ڈاکہ زنی سے تائب ہوئے تھے۔ پیرانہ سالی نے تائب ہونے پر آمادہ بلکہ مجبور کیا تھا۔ انھوں نے سنایا کہ ہمیشہ خدا کے فضل سے پولیس کے ہاتھوں سے بچے رہے کیونکہ کبھی کسی کمزور کو نہیں ستایا۔ البتہ ایک بار لوگ جاگ پڑے۔ ہم کو بھاگنا پڑا۔ بھاگتے ہوئے ہمارا بلّم ایک بڑھیا کی آنکھ میں لگ گیا۔ بس اس کی سزا ملی کہ پکڑے گئے۔ جیل ہو گئی۔ یہ ایک بدنام آدمی کا واقعہ ہے سب ہی اس کی تحقیر کریں گے۔ لیکن یہ انداز فکر ہمارے سماج میں کتنا پھیلا ہوا ہے۔ اس کا اندازہ لگانا ہو تو شریفوں میں بیٹھئے۔ بڑے آدمیوں کی بے تکلف بزموں میں شریک ہوئے۔ منہ بند رکھئے۔ کان کھلے رکھئے۔ تب آپ سنیں گے۔ کہ نوکری نہیں۔ کاروبار نہیں مختصر یہ کہ دنیا میں تو سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ مگر ہم برابر غریبوں اور یتیموں کا خیال رکھتے

ہیں۔ اپنے سے جو بن پڑتا ہے وہ کارِ خیر بھی کرتے ہیں۔ حتی الامکان کسی کمزور کو ستاتے بھی نہیں ہیں۔ اور خدا کے فضل سے مشکل کام آپڑتے ہیں کہ جیل ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے مگر خدا بچا لیتا ہے۔ خدا کیا بچا لیتا ہے بس یہی نیکیاں کام آجاتی ہیں۔ کیوں نہ ہو ہم خدا کے کام کرتے ہیں وہ ہمارے کام آتا ہے۔

مختصر یہ کہ ہم خدا سے اگر ڈرتے ہیں تو دنیا کے نقصان کے لئے (ہمارے خیال میں بس یہی دوزخ ہے) یا ڈرتے ہیں تو دنیا کے نفع کے لئے کہ کہیں چھوٹ نہ جائے۔ ہمارے خیال میں دنیاوی نفع میں جنّت ہے)۔ رہا خدا کے عذاب و سزا سے ڈرنا اور اس کے لئے دین کے حلال و حرام۔ واجب اور گناہ کا جاننا۔ یہ پاپڑ ہم سے نہ بیلے جائیں گے۔ ہم نہ تقلید کے چکر میں پڑیں گے۔ نہ دین کی پابندی کا لخلخہ ہم سے ممکن ہے ہم تو جو کرتے آئے ہیں بس وہی کرتے رہیں گے اگرچہ قرآن یہی کہتا ہے۔

کہ ذرہ برابر نیکی کرو گے تو اس کی جزا پاؤ گے اور ذرہ برابر گناہ کرو گے تو اس کی سزا پاؤ گے۔

لہٰذا اگر ہم کو اپنے اوپر۔ اپنی اولاد پر۔ اپنے خاندان پر۔ اپنی قوم پر رحم کرنا ہے۔ ظلم نہیں کرنا ہے۔ تو ہم کو رواج کے بجائے دین کو ماننا ہوگا۔ اور دین کے احکام جاننے کے لئے اعلم کی تقلید کرنا ہوگی۔ اپنی زندگی کو فقہ کے خانے کے اندر رکھنا ہوگا۔ ورنہ جو زندگی فقہ کے خانے سے باہر ہوگی۔ اس کی جگہ دوزخ میں ہوگی اور صرف دوزخ میں۔ یہی قرآن کا بیان ہے، یہی خدا کا فرمان ہے۔ یہی نبیؐ کا پیغام ہے۔ یہی حکم امامؑ ہے۔

حکومت علیؑ کا حق ہے

آیۂ بلغ کے نزول پر حضرت نے جناب امیرؑ کے لئے "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" فرمایا اور اس فرمان کے بعد آیۂ اکملت اتری۔ لہذا ضرورت ہے کہ ذہن "من کنت مولاہٗ فعلی مولاہ" کے بارے میں صاف رہیں کیونکہ لفظ مولیٰ کے بہت سے معنی ہیں اور ہر معنی کا مراد لیا جانا ممکن ہے شیعہ کہتے ہیں کہ جس طرح نبی روحانی پیشوا ہونے کے علاوہ دنیا میں بھی مسلمانوں کے حاکم اور سربراہ تھے اسی طرح آپ کے بعد علیؑ مسلمانوں کے روحانی پیشوا اور حاکم ہیں اور پیغام غدیر میں حضورؐ نے حضرت علیؑ کے اسی حق حکومت کا اعلان فرمایا تھا۔ اگر شیعوں کی یہ بات سچی ہو تو خلافت ابوبکر و عمر وغیرہ باطل ہے اور ان خلافتوں کا ماننے والا سنی مذہب بھی باطل ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ لفظ مولیٰ کے معنی معلوم ہوں۔ تمام کتابیں متفق ہیں کہ حضورؐ نے غدیر میں مولیٰ کے استعمال سے پہلے مسلمانوں سے پوچھا تھا کہ:

"مومنین کی جان اور زندگیوں پر مومنین کا حق ہے یا میرا؟" اور مسلمانوں نے بلا اختلاف کہا تھا، ہماری جان پر آپ کا حق ہے نہ کہ ہمارا۔ اس سوال اور اقرار کے بعد آپ نے فرمایا تھا جس کا میں مولا ہوں علیؑ بھی اس کے مولیٰ ہیں۔ مسند احمد ابن حنبل جلد ۴ صفحہ ۲۸۱ صواعق محرقہ ابن حجر مکیؒ

ص۲۵ باب ۱ مطبوعہ میمینہ مصر۔

معلوم ہوا کہ آنحضرتؐ نے مولیٰ کے لفظ ——————

کے معنی پہلے بتلائے اور لفظ مولیٰ اس کے بعد استعمال کیا۔ یعنی جسے مومنین کی جان پر مومنین سے زیادہ حق ہو وہ مولیٰ ہوتا ہے اور اسی معنی سے نبیؐ اور علیؑ مولیٰ ہیں —— جان اور زندگی پر زندگی والے سے زیادہ کون حق رکھتا ہے اسے اس قانون کی روشنی میں معلوم کیجئے جسے ہمیشہ سے تمام اقوام عالم کی حکومتوں نے تسلیم کیا ہے اور جسے ہر مذہب کے ضابطۂ اخلاق کی تائید حاصل ہے یعنی خودکشی کرنے کی اجازت نہ کسی مذہب نے دی ہے نہ کسی قانون نے نہ کسی ضابطۂ اخلاق نے بلکہ خودکشی کرنے والے کو اقوام عالم مجرم قرار دیتی ہیں اور حکومتیں خودکشی کرنے والے کو سزا دیتی ہیں۔ اگر زندگی اس کی اپنی ملکیت ہوتی جس کی زندگی ہے تو اسے اپنی زندگی دینے کا حق ہوتا جس طرح ہم اپنی ہر ملکیت کے بارے میں خود مختار ہیں۔ اس کے برخلاف حکومت کا خودکشی کرنے میں مداخلت کرنا اور سزا دینا بتاتا ہے کہ زندگی، ہماری ملکیت نہیں ہے بلکہ حکومت کی ملکیت ہے اور خودکشی کرنے والا قرار پاتا ہے لہذا مستوجب سزا ہے۔ جب یہ ثابت ہوگیا کہ جان زندگی کا مالک صرف حکومت ہوتی ہے تو رسولؐ کے سوال کا مطلب یہی تھا کہ تم مجھے مومنین کا حاکم مانتے ہو یا نہیں مسلمانوں نے اقرار کیا آپ ہمارے حاکم ہیں اقرار کے بعد رسولؐ کے ارشاد کا مطلب واضح ہے کہ:

"جس طرح میں مومنین کا حاکم ہوں اسی طرح علیؑ بھی مومنین کے حاکم ہیں۔"

لہذا مومنین کی جماعت میں صرف وہی شامل ہوگا جو نبیؐ کے بعد علیؑ

کو حاکم تسلیم کرے گا اب اگر کوئی دوسرا حاکم بنتا ہے یا ہم اس کی حکومت کی حمایت کرتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں ——— تو ہم سب ناحق اور باطل پر ہیں۔ حق پر صرف وہی ہے جو علیؑ کو بعد نبیؐ بلا فصل حاکم تسلیم کرتا ہے۔

واضح حق اگر غدیر میں لفظ مولیٰ کے معنی حاکم کے علاوہ کچھ اور ہوتے تو حضرت علیؑ کو کوئی منصب یا عہدہ نہ ملتا تو حضرت عمرؓ حضورؐ کے اعلان من کنت مولاہ الخ کے بعد خصوصی مبارکباد نہ دیتے اور تمام اصحاب حتیٰ کہ ازواج پیغمبرؐ آپ کو مبارکباد نہ دیتیں۔ حالانکہ حضورؐ کے اعلان کے بعد۔

"حضرت عمر نے حضرت علیؑ کو مبارکباد دی کہ آج تم ہر مومن و مومنہ کے مولیٰ (حاکم) ہوگئے اور یہی مبارکباد اصحاب اور ازواج نے بھی دی"

ملاحظہ ہو مسند احمد ابن حنبل جلد ۴ ص ۲۸۱

مخالفتِ علیؑ کی حد واقعہ غدیر سچا تھا اور حضرت علیؑ کا حق حکومت واقعہ تھا۔ مگر سچی بات کے جھٹلانے والے اور وفات پیغمبرؐ کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ سے حکومت و خلافت شروع کرنے والوں کے مخالف طرز عمل کو واقعہ غدیر کو غلط ثابت کرنے کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ کہ اگر حضورؐ نے علیؑ کی خلافت بتائی ہوتی تو مسلمان کیوں نہ مانتے اور مسلمانوں نے نہیں مانا لہذا حضورؐ نے خلافت علیؑ کا حکم ہی نہیں دیا تھا۔ صرف ایک فریب ہے جس میں مسلمانوں کے ذہنوں کو مبتلا کرکے ان کو حق سے ہٹایا جا رہا ہے۔ ہونا یہ چاہیئے تھا کہ جن لوگوں نے حضورؐ کے حکم خلافت علیؑ کو نہیں مانا ان کو نہ مانا جاتا اور کہا جاتا کہ انھوں نے حکم رسولؐ نہیں مانا لہذا یہ لوگ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کو مانا جائے لیکن اس کے برخلاف صورت حال

یہ ہے کہ ان مخالفین حکم رسولؐ کو بہر صورت مان لیا گیا ہے لہذا کہا جاتا ہے کہ انھوں نے خلافت علیؑ کو نہیں مانا کیونکہ رسولؐ نے حکم ہی نہیں دیا تھا اور اس جھوٹ کو سچ کے مقابلہ میں پیش کرنے کے لئے کہا جاتا ہے کہ "کیسے ممکن ہے کہ رسولؐ حکم دیں اور مسلمان خصوصاً اصحاب کبار حکم رسولؐ نہ مانیں" لیکن آیۂ بلغ جس کے نازل ہونے پر حضورؐ نے خلافت علیؑ کا حکم مسلمانوں کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس آیت کا ایک فقرہ آج بھی اس بات کا گواہ اور ضامن ہے کہ مسلمان اور اصحاب کبار حضورؐ کے غدیری حکم ماننے والے نہ تھے۔ کیونکہ آیت کا آخری فقرہ ہے۔ وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ (رسولؐ حکم خلافت علیؑ) پہنچا دو دشمنوں سے ہم تمہاری حفاظت کریں گے) یہ حکم صرف مسلمانوں کے سامنے پیش ہوا تھا اور مسلمانوں سے متعلق تھا مگر اس حکم کے پہنچانے میں رسولؐ کو اپنی جان کا خطرہ تھا اور اتنا سخت خطرہ کہ خدا وعدہُ حفاظت کر رہا تھا معلوم ہوا اگر مسلمان یہ حکم ماننے والے ہوتے تو حکم پہنچانے والے رسولؐ کے لئے حکم پہنچانے میں خطرہ نہ ہوتا۔ خطرہ نہ ہوتا تو خدا حفاظت کا انتظام نہ کرتا۔ بلکہ خطرہ تھا اور صرف مسلمانوں سے خطرہ تھا کیونکہ خلافت علیؑ کے مخالف۔ غیر کیوں ہوتے انھیں اس مسئلہ سے کیا سروکار تھا البتہ بعد نبیؐ حکومت کرنے کے خواہش مند مسلمان خلافت علیؑ کے مخالف تھے نہ صرف مخالف بلکہ دشمن۔ نہ صرف علیؑ اور ان کے حق خلافت کے دشمن بلکہ اگر رسولؐ حکم خلافتِ علیؑ بحکم خدا بھی پہنچائیں تو یہ مخالف اور دشمن۔ نبیؐ کی جان کے دشمن ہو جائیں اور اگر خدا حفاظت نہ کرے تو حضورؐ کو قتل کر دیں ۔۔ ان حالات کا تقاضہ یہی تھا کہ بعد نبیؐ۔ علیؑ کو ان کا حق حکومت و خلافت نہ ملے اور نہیں ملا۔

لوگ کہتے ہیں کیسے ممکن ہے کہ رسولؐ کہیں اور مسلمان وصحابہ کبار، نہ مانیں۔ میں پوچھتا ہوں یہ کیسے ممکن ہے مسلمان اور صحابہ کبار رسولؐ کے دشمن ہو جائیں۔ مگر یہ ممکن نہیں بلکہ واقعہ تھا جس کا گواہ قرآن ہے تو حضورؐ کے بعد جناب امیرؑ کو خلافت نہ ملی تو حالات ہی کہہ رہے تھے کہ نہ ملے گی البتہ اگر مل جاتی تو حیرت ہوتی۔ اگر مل جاتی تو لوگ سوچ سکتے تھے کہ رسولؐ کے اثرات نے علیؑ کو خلافت دلوائی۔ مگر ۲۵ سالہ تین خلافتوں کے باوجود ۳۵ھ میں علیؑ کو خلافت ملی تو صرف یہ علیؑ کے اثرات تھے۔ خلافت ملی تھی یا تاریخ کا "عظیم معجزہ" ہو رہا تھا ——— حق واضح ہے۔ جس کا جی چاہے اپنی آنکھ کے ساتھ عقل وہوش و دیانت کو بھی بند کرلے۔

فیصلہ کیجئے

کہا جاتا ہے اگر حضرت علیؑ کی خلافت بلافصل مان لی جائے تو بڑے بڑے صحابہ بلکہ وفات پیغمبرؐ کے بعد سے اب تک کے مسلمانوں کی بڑی تعداد کو گمراہ اور دوزخی ماننا پڑے گا اور جنّتی صرف شیعہ قرار پائیں گے جن کی تعداد آج بھی بہت کم ہے اور ماضی میں تو بہت ہی کم تھی لہذا یا اکثریت کو دوزخی مانا جائے اور علیؑ کو خلیفہ بلافصل مانا جائے۔ یا خلافت بلافصل علیؑ سے انکار کیا جائے اور اسلام کی اکثریت اور بڑے بڑے مسلمانوں اور صحابہ کبار کو جنتی مانا جائے لہذا اسلام کی اکثریت اور صحابہ کبار کی حمایت کا تقاضا یہی ہے کہ "خلافت بلافصل" کے عقیدے سے انکار کیا جائے۔ مسئلہ اگر سیاسی ہوتا تو مذکورہ بالا حساب کی بڑی قیمت تھی لیکن مسئلہ دینی ہے۔ لہذا مصالح ومفاد افراد کے بجائے حقیقت کا سامنا کرنا، حق کی پیروی کرنا ضروری ہے مذکورہ بالا

مخالفین "خلافت بلا فصل علیؑ" کا کہنا ہے کہ اس عقیدے کو ماننا مسلمانوں کی بڑی تعداد اور عظیم اکثریت کو دوزخی ماننا اور صرف ایک فرقہ شیعہ کو جنتی ماننا ہے۔ ہم کو تسلیم ہے کہ صورت حال یہی ہے مگر تمناؤں سے صورت حال نہ بدلتی ہے نہ بدلی جاسکتی ہے آئیے نبیؐ سے معلوم کرلیں کہ مسلمانوں کی اقلیت و اکثریت میں کون دوزخ میں جائے گا اور کون جنت میں؟ تو حضورؐ فرمائیں گے میں نے تو اقلیت و اکثریت کے طبقات تقسیم سے قبل خبر دی تھی جس کا حوالہ نقل کیا جا چکا ہے کہ:

"میرے بعد مسلمانوں میں ۷۳ فرقے ہوں گے جن کی عظیم اکثریت ۷۲ فرقے دوزخ میں جائیں گے اور معمولی اقلیت صرف ایک فرقہ جنت میں جائے گا۔"

کیا مسلمان تیار ہیں کہ ارشاد پیغمبرؐ کی روشنی اور تاریخ کے آئینہ میں فیصلہ کریں کہ:

"اکثریت میں کون تھا اور ہے اور اقلیت میں کون اور قیامت کے دن اقلیت کہاں ہوگی اور اکثریت کہاں۔"

ع ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

نبی کو مانئے یا خلفا کو

حضورؐ کی وفات کے بعد سقیفۂ بنی ساعدہ میں ابوبکر خلیفہ بنے انھوں نے اپنے بعد عمر کو بنایا اور آپ کی مقرر کردہ مجلس شوریٰ نے علیؑ کی مخالفت کرکے عثمان کو خلیفہ بنایا۔ ان کے بعد عہد معاویہ سے "ترکی خلافت" تک صرف دنیاوی حکومت تھی خلافت ان سے پہلے ختم ہوگئی تھی یہ ہے مسئلہ خلافت کا وہ خلاصہ جس پر سنی مذہب کی بنیاد ہے۔

اور اس خلافت کی بنیاد ہے کہ "حضورؐ نے اپنی زندگی میں کوئی خلیفہ مقرر نہیں کیا تھا بلکہ مسئلہ خلافت امت کے طے کرنے کے لئے چھوڑا تھا۔" مگر حضورؐ نے اپنی تبلیغ کے آغاز کے دن اپنی پہلی تقریر میں دعوت ذوالعشیرہ میں خلافت، علیؑ کے حوالہ کر دی تھی۔ تفصیل درج ذیل ہے۔

تین سالہ مخفی تبلیغ کے بعد۔

"جب حضورؐ کو حکم ہوا کہ کھلی تبلیغ کریں اور سب سے پہلے اپنے قرابتداروں میں اظہار تبلیغ کریں تو حضرت کے حکم سے حضرت علیؑ نے بنی عبدالمطلب کو مدعو کیا جو چالیس آدمی تھے۔ پہلے دن ابولہب نے تقریر پیغمبرؐ سے مجمع کو یہ کہہ کر بھڑکایا اور اٹھایا کہ محمدؐ جادو کر رہے ہیں کیونکہ کھانا کم تھا۔ حضرت نے پہلے اسے چکھ کر کہا بسم اللہ کھاؤ اور کھانا اتنا رہا کہ سب لوگوں نے سیر ہو کر کھایا۔ دوسرے دن حضورؐ کے حکم سے حضرت علیؑ نے پھر سامان ضیافت کیا اور سب لوگ جمع ہوئے۔ حضورؐ نے تقریر فرمائی کہ اے لوگو! میں خیر دنیا و آخرت (اسلام) تمھارے پاس اپنے خدا کے حکم سے لایا ہوں۔ تم میں سے کون ہے جو اس کام میں میرا شریک ہو کر میرا بھائی۔ وصی اور تم میں میرا خلیفہ ہو۔ باوجود کمسنی کے حضرت علیؑ نے مدد کا وعدہ کیا۔ حضورؐ نے جناب امیر کی گردن پر ہاتھ رکھ کر فرمایا۔ "یہ میرا بھائی۔ وصی اور تم میں میرا خلیفہ ہے اس کی اطاعت تم پر فرض ہے۔" مجمع مذاق اڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور جناب ابوطالب سے کہا یہ تم کو بیٹے کی اطاعت کا حکم دیتے ہیں۔"

کنزالعمال ج ۶ کتاب الفضائل۔ باب فضائل علی علیہ السلام ص ۳۹۷ مطبوعہ دائرۃ المعارف النظامیہ حیدرآباد ۱۳۱۴ھ ابوالفدا جلد ۱ ص ۱۱۶، ۱۱۷ مطبوعہ الحسینیہ مصریہ) تاریخ کامل جلد ۲ ص ۲۲ تاریخ طبری

جلد ۲ صـ ۲۱۷ (مطبع حسینیہ مصر)

مذکورہ بالا واقعہ کے بعد اگر خلفا برحق تھے تو رسولؐ نے وقتِ وفات انتخاب خلیفہ کا حق امت کو دیا تھا مگر آپ حق انتخاب امت کو تب دے سکتے تھے، جب علیؑ کے حق کی خلاف ورزی کرتے کیونکہ نصرت نبوت کے وعدہ پر علیؑ کو ذوالعشیرہ میں خلیفہ بنا چکے تھے۔ اور علیؑ حق نصرت ادا کر چکے تھے۔ لہذا بات اس منزل پر آجاتی ہے کہ خلفا برحق ہوں تو حضورؐ کا م نکل جانے کے بعد علیؑ کو ان کا حق دینے اور اپنا وعدہ پورا کرنے کے بجائے حق تلفی فرمائیں یا حضورؐ کا دامن حق تلفی اور وعدہ کی خلاف ورزی کے عیب سے پاک مانا جائے جیسا کہ ہر عیب سے پاک ہے تو خلفا ناحق۔ غاصب باطل قرار پاتے ہیں لہذا مسلمان کو فیصلہ کرنا ہے کہ وہ نبیؐ کو پاک کردار کا مانے یا خلفا کو حق مانے۔ ہم کو تو اسلام حضورؐ کے قدموں سے ملا ہے۔ کسی دوسرے کی ہمیں کیا فکر۔

حضرت علیؑ کی حکیمانہ خاموشی بعد وفات پیغمبر

وفات سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت علیؑ کی زندگی میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے سطحی ذہنوں میں بعض سوالات بلکہ اعتراضات حضرت علیؑ کے بارے میں پائے جاتے ہیں جن کو علیؑ کے دشمنوں نے کچھ اس طرح اچھالا ہے کہ غیر تو غیر جناب امیرؑ کو امامؑ و مولا ماننے والوں کو بھی الجھن کا سامنا کرنا ہوتا ہے لہذا ضرورت ہے کہ حالات، ماحول، واقعات کو ان کے اسباب و نتائج کی روشنی میں قابل لحاظ غور کے ساتھ سمجھا جائے تاکہ معلوم ہو کہ "الجھنیں، اصل میں "حکمتیں" ہیں ناواقف کے لئے حکمت ہمیشہ الجھن ہی بنی رہتی ہے۔ لغت میں دو لفظ ملتے ہیں۔ ایک جوش دوسرا ہوش دونوں کے تقاضے اور نتائج اور طریقہ ہائے کار میں بنیادی اور عظیم فرق ہیں جہاں دونوں کے مناسب اور لطیف امتزاج سے فرد و قوم کی تعمیر ہوتی ہے وہاں غیر معتدل ہو کر ہر ایک تخریب کا سبب بھی بنتا ہے۔

مذکورہ بالا مفہوم کو سمجھنے کے لئے ذیل کی مثال کو تفصیل کے ساتھ سمجھنا بہتر ہوگا۔ ہم ایک برتن میں پانی رکھتے ہیں پانی کا مزاج پستی کی طرف مائل ہے ابھی اس میں نہ کوئی قوت ہے نہ حرکت لیکن برتن کے نیچے جب آگ جلائی جاتی

ہے توصورت حال بدلتی ہے اگرچہ آگ و پانی میں بیر ہے مگر برتن درمیانی رابطے کا کام کرتا ہے کہ آگ کو بجھنے سے محفوظ رکھتا ہے۔ پانی میں گرمی پیدا کرتا ہے گرمی بڑھتی رہتی ہے پانی میں جوش آتا ہے اور ساکن پانی میں حرکت، بے جان پانی میں حرکت پیدا ہوتی ہے پستی کی طرف رُخ کرنے والا پانی مائل پرواز ہوتا ہے اس کے لطیف اجزا بھاپ بن کر اڑنا شروع کرتے ہیں اگر بھاپ کو نکال دیں تو جوش کم ہو جائے گا اگر بالکل نہ نکلنے دیں تو برتن پھٹ کر تباہی کا سامان بنے گا برخلاف اس کے اگر آگ کو ایک معیار پر قائم رکھیں بھاپ کو جمع کرتے رہیں اور مناسب طور پر خرچ کریں تو انجن چلنے لگتے ہیں ہم روز دیکھتے ہیں ریل اسی بھاپ سے چلتی ہے۔

مذکورہ بالا مثال کی تین باتیں یاد رکھنے کے قابل ہیں اگر آگ نہ ہوتی تو جوش نہ پیدا ہوتا، اور جوش نہ ہوتا تو حرکت، قوت اور زندگی نہ ہوتی، لیکن اگر جوش کو بڑھاتے جائیں تو بھاپ کو بالکل بند کرنا تباہی کا سبب ہوگا،، بالکل نکال دینا ضعف بنے گا۔ اس کے برخلاف اگر بھاپ پر قابو رکھیں تو یہ قوت صرف تعمیر ہوتی ہے انسان میں غصہ کی آگ تنہا رہے تو جلے گا اور جلائے گا غصے سے حرکت میں آنے والی قوتوں کو غصہ اتارنے میں صرف کرنا کمزوری کا سبب بنے گا لیکن غصے کو قابو میں رکھنے سے شجاعت پیدا ہوگی جوش کا نہ ہونا موت ہے زندگی میں محض جوش تباہی ہے البتہ دونوں کو معتدل رکھنے سے شجاعت پیدا ہوگی جس سے فرد و قوم کے اخلاق و کردار کی تعمیر ہوگی۔ جناب امیرؑ کی وفات پیغمبرؐ کے بعد کی زندگی کو جب محض جوش کے تقاضوں سے دیکھا جائے گا تو ہر جگہ زندگی قابل اعتراض معلوم ہوگی ہر روش نکتہ چینی کے قابل دکھائی دے گی لیکن اگر جوش کو ہوش کے قابو میں دے کر علیؑ کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی

توعلیؑ کی حکیمانہ زندگی پر فریفتہ ہونا پڑے گا ۔ یقیناً علیؑ سے یہ پرجوش مطالبہ کیا جاسکتا ہے کہ خلافت چھننے اور مصائب کے وقت تلوار کیوں نہیں اٹھائی چاہے نتیجہ "کچھ بھی ہوتا" مگر علیؑ نتیجہ کچھ بھی ہوتا کے قائل ہوتے تو آج علی سب کچھ ہونے کے بجائے کچھ بھی نہ ہوتے ۔

وفات پیغمبرؐ کے بعد علیؑ کی حکیمانہ خاموشی ہوش کے تقاضے کو پورا کرتی ہے نہ بھولنا چاہیئے کہ وفات پیغمبرؐ کے پہلے بھی علیؑ ہوش نہیں کھوتے تھے ۔شب ہجرت نبیؐ کے ساتھ رہنے کے جوش کے بجائے علیؑ بستر نبیؐ پر سوکر "فداکارانہ ہوش" کا مظاہرہ کرتے ہیں ۔ جنگ احد میں مسلمانوں بلکہ اصحاب پیغمبرؐ کے جوش فرار کو دیکھ کر بھی آپ ہوش کو باقی رکھتے ہیں جنگ خندق میں جب عبدود کا فرزند عمرو سراپا جوش بن کر آتا ہے تو علیؑ اس کے مقابل میں سراپا ہوش بن کر آتے ہیں آج جوشِ کفر اور ہوش ایمان نظر آتا ہے ۔ سراپا جوش اور کل کفر عمر وابن عبدود کے مقابلے پر علیؑ سراپا ہوش کل ایمان بن کر جاتے ہیں ۔ وہ جوش میں نبیؐ کے خیمے پر نیزہ زن ہے ۔مسلمانوں کی بزدلانہ خاموشی پر طعنہ زن ہے جوش میں بھر کر اپنے وفادار گھوڑے کو پے کئے دیتا ہے تو علیؑ سکون کے ساتھ تلوار کے سائے میں کھڑے ہو کر رفع شر کے لئے اسلام کو پیش کر رہے ہیں ۔ عمرو کے انکار اسلام پر نہ جنگ معاہدے کی پیش کش کر رہے ہیں ۔ اور عمرو کے سینے سے اتر کر جوش پر ہوش کی بلندی کا مظاہرہ کر رہے ہیں ایسے باہمہ ہوش علیؑ سے وفات پیغمبرؐ کے بعد "مجسم جوش" بن جانے کا مطالبہ اندازہ کی غلطی ہے بلکہ علیؑ سے زندگی کی قدروں کو بدلنے کا مطالبہ ہے جو اگر کسی کے لیے قابل عمل بھی ہو تو روش پر مر مٹنے والے حسینؑ کے باپ علیؑ کے لئے بہر حال ناقابل عمل بلکہ عملاً ناممکن ہے ۔ حالات کا ذرا تفصیل سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے

تاکہ علیؑ کی روش کو متعین کرنے میں مدد ملے ورنہ آنکھیں بند کر کے منہ کھول دینے میں کیا لگتا ہے۔ زبان اپنی ہے ایک سانس میں جتنے چاہو علیؑ پر اعتراض کر ڈالو جب اعتراض سے خدا اور رسولؐ کی ذات نہیں بچ سکی تو علیؑ کیسے بچ سکتے ہیں بلکہ اعتراض ہوتا ہی اس پر ہے جس کی بلندی دل میں تسلیم ہوتی ہے چاہے زبان سے اقرار نہ ہو، لہٰذا اگر علیؑ پر اعتراض نہ ہوتے تو بلندی ذات علیؑ مشتبہ رہ جاتی علیؑ سے میری باہوش عقیدت مخالف کے "معترضانہ جوش" کی شاکی نہیں بلکہ شکر گزار ہے کہ اعتراضوں نے علیؑ کو مزید سمجھنے میں نہ صرف مدد دی بلکہ اس حد تک سمجھنے پر مجبور کیا کہ اب شک و شبہ کے پر میرے یقین کو چھونے سے پہلے خود ہی جل جاتے ہیں۔ بیشک جب خدا کی مرضی ہوتی ہے تو دشمن یوں ہی سبب خیر بنتا ہے۔

یقیناً حضور سرورکائناتؐ نے اپنی زندگی میں مسلسل اور واضح طور پر امت کی قیادت کے لئے حضرت علی علیہ السلام کو نامزد کیا تھا یہ بات امت بھی جانتی تھی اور حضرت علیؑ بھی۔ لیکن یاد رکھنے کے قابل یہ بات ہے کہ نبوت نے جہاں امامت کے حقوق اپنے جیسے قائم کئے تھے وہاں فرائض بھی اپنے جیسے رکھے تھے۔ حقوق کو یاد رکھنا اور پورا کرنا امت کا کام تھا فرائض کو انجام دینا حضرت علیؑ کا فرض تھا اگر امت حقوق کی ادائیگی میں خلاف ورزی حکم رسولؐ کرتی ہے تو علیؑ سے مطالبہ کرنا کہ وہ فرائض کو بھول کر اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے تلوار اٹھالیں کتنا بے جا مطالبہ ہے فرعون نے بندگی بھلائی مگر خدا نے خدائی نہیں چھوڑی۔ اُمت نے پیروی چھوڑی مگر نبی نے ہدایت نہیں چھوڑی تو مسلمانوں کے غلط طرز عمل پر جناب امیر اپنے فرائضِ مشکلکشائی اور فرائض قیادت کیونکر چھوڑ دیتے۔ اعتراض ہے کہ آپ تلوار کیوں نہیں اٹھاتے جبکہ

تلوار اٹھانے کے نتیجے میں معترض بھی کسی قابل اطمینان صورت حال سے اپنے ذہن کو خالی پاتا ہے ورنہ "چاہے نتیجہ کچھ بھی ہوتا" کا جملہ زبان تک نہ آتا تلوار نہ اٹھانے کے مصالح تب ہی سمجھ میں آسکتے ہیں جب تلوار اٹھانے کی صورت میں جو نتائج پیدا ہوتے ان کا صحیح جائزہ لیا جائے۔ تلوار اٹھانے کے بعد دو ہی صورتیں پیدا ہو سکتی تھیں یا حضرت علیؑ کو ساتھی ملتے یا نہ ملتے کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے زمانہ پیغمبرؐ میں ۲۳ سال تک جو اسلام کی سرفروشانہ خدمتیں انجام دی تھیں ان کے پیش نظر مسلمان آپ کی مدد و نصرت کے لئے ضرور کھڑے ہو جاتے لیکن صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے حضرت علیؑ نے جو اسلام کی خدمتیں انجام دی تھیں وہی مددگاروں کو کم کرنے کا سبب بن رہی تھیں آپ کے ہاتھوں جس قدر لوگ قتل ہوئے تھے ان کے وارث اب مسلمان ہو کر علیؑ کی مخالفت میں کمربستہ تھے قبیلہ کے رشک و حسد نے علیؑ کے خلاف متفق مجمع کو جمع کرنے میں مدد دی تھی ذیل میں دو تاریخی باتیں درج کی جاتی ہیں جن سے اندازہ ہو جائے گا کہ آپ اپنے حق کو طلب کرنے کے لئے اٹھتے تو ساتھی نہ ملتے۔

آنحضرتؐ جس بیماری میں انتقال فرماتے ہیں اس بیماری کے دوران میں وصیت لکھنے کے لیے قلم دوات مانگتے ہیں جبکہ وصیت نامہ کے مقصد کی وضاحت بھی کر رہے ہیں کہ اس کے بعد اُمت گمراہ نہ ہوگی۔ جواب میں قلم و دوات فراہم کرنے کے بجائے رسولؐ پر ہذیان کا الزام لگانے والے وہی بزرگ ہیں جو وفات پیغمبرؐ کے بعد ابوبکر کی بیعت کر کے خلافت کی بنا ڈالتے ہیں طرز عمل بتلا رہا ہے کہ وصیت نامہ لکھے جانے سے پہلے وصیت نامے کا مفہوم معلوم ہو گیا تھا جسے آج بھی بغیر کسی قیاس کے رسولؐ کی حدیث کے معلوم کیا جا سکتا ہے پیغمبرؐ جو وصیت نامہ لکھنا چاہتے ہیں اس کی صفت بیان کرتے ہیں

کہ اس کے بعد امت گمراہ نہ ہوگی اور آج بھی آپ کا ارشاد موجود ہے کہ کتاب خدا اور اہلبیتؑ سے تمسک رکھنے میں گمراہی نہ ہوگی۔ لہذا وصیت نامہ قرآن اور اہلبیتؑ ہی کے متعلق تھا اگر الزام ہذیان لگانے والا وصیت نامے کے مفہوم سے پوری طرح باخبر نہ ہوتا تو الزام ہذیان کے ساتھ "کتاب خدا کافی ہے" کی بات نہ کہتا۔ کتاب کافی ہے کا مطلب ہی یہ ہے کہ پیغمبرؐ جب دوسری چیز کو کتاب کے ساتھ شامل کرنا چاہتے ہیں معترض اسے فضول بلکہ مضر سمجھتا ہے اور ایک جز یعنی کتاب کو کافی کہتا ہے۔ مخالفت دوسرے جز کی ہے اور حدیث ثقلین کی موجودگی میں ہر صاحب عقل تسلیم کرے گا کہ دوسرا جزء اہلبیتؑ تھے جن کی مخالفت کی جارہی ہے۔ معلوم ہوا کہ رسولؐ کی زندگی میں اہلبیتؑ کی حمایت پر رسولؐ کی توہین آمیز مخالفت کی جاتی ہے، مگر کوئی مسلمان رسولؐ کی حمایت کے لئے نہیں اٹھتا نتیجہ واضح ہے کہ علیؑ کی حمایت پر جب رسولؐ بے اثر ہوجاتے ہیں تو بعد رسولؐ کون حضرت علیؑ کی حمایت کے لئے اُٹھتا۔ دوسری تاریخی شہادت یہ ہے کہ جناب فاطمہؑ فدک کی جائداد کا مقدمہ دربار میں خود آکر پیش کرتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ فدک بہت معمولی سی جائداد تھی مگر رسول کی محبوب بیٹی خود دربار میں مسلمانوں سے کہتی ہے کہ میرا حق دلادو۔ مگر کوئی مسلمان اس کو جائداد دلانے کے لئے نہیں اٹھتا تو حکومت دلانے کے لئے علیؑ کی مدد کون کرتا۔

کہا جاسکتا ہے کہ فاطمہؑ کا دعویٰ غلط تھا رسولؐ نے فرمادیا تھا کہ ہم ملکیت نہیں چھوڑتے لہذا ہماری میراث کے لئے کوئی وارث دعویٰ نہیں کرسکتا تو مسلمان فاطمہؑ کو کیسے فدک کی جائداد دلاتے۔ لیکن تعصب کو چھوڑ کر اگر غور کیا جائے تو حکومت کے فیصلے اور عدم میراث پیغمبرؐ کو بحال رکھتے ہوئے بھی فاطمہؑ کو جائداد فدک دلائی جاسکتی تھی جس کی صورت یہ تھی کہ رسولؐ کی چھوڑی ملکیت میراث

نہیں بلکہ صدقہ ہے۔

لہذا فاطمہؑ کے بجائے قوم اس کی مالک تھی اور حکومت قومی مفاد کے تحفظ کی ذمہ دار تھی لیکن اگر قوم یہ فیصلہ کرتی کہ ہم اپنا حق اپنی خوشی سے فاطمہؑ کو دیتے ہیں تو حکومت کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا اور قومی ملکیت کو فاطمہؑ کو دیا جانا طرز عمل رسولؐ سے ثابت ہو چکا تھا کہ آپ نے زندگی میں جناب فاطمہؑ کو فدک کی جائداد دی تھی۔ جائداد کا دینا سب کو تسلیم ہے عارضی طور پر دی تھی یا ہبہ کر کے مستقل طور پر دی تھی معرض بحث میں یہ بات تھی لہذا قوم کم از کم عارضی طور پر پھر جائداد جناب فاطمہؑ کو دینے پر تیار ہو جاتی۔ اگر جناب فاطمہؑ نہ قبول کرتیں تب بھی قوم اپنے فرض محبت سے ادا ہو جاتی۔ اتنی آسان بات کے لئے بھی قوم تیار نہ ہوئی تو حکومت دلانے کے لئے کون تیار ہوتا۔

لہذا ثابت ہوا کہ اگر جناب امیرؑ اپنے حق خلافت کو حاصل کرنے کے لیے تلوار اٹھاتے تو ساتھی نہ ملتے۔ ساتھی نہ ملنے کا آپ کو یقین تھا اور ہونا بھی چاہیئے تھا مگر پھر بھی آپ نے احتجاج کیا۔ ایک ایک سے کہا جناب فاطمہؑ کو لے کر گئے، مگر سب نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اب تو حکومت قائم ہو چکی ہم مدد کرنے سے معذور ہیں کیا اس کے بعد بھی یہ مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ آپ تلوار لے کر اٹھتے بعض جوشیلی طبیعتیں اب کہیں گی کہ کچھ بھی تھا مگر آپ کو تلوار اٹھانا چاہیئے تھی یعنی ساتھی نہ بھی ملتے تب بھی آپ تلوار اٹھاتے تو نتیجہ کیا ہوتا یہی تو کہ آپ شہید ہو جاتے اور ظاہر ہے کہ جو بھی ماننے والے موجود تھے وہ اپنی زندگی میں آپ کو شہید نہ ہونے دیتے جس طرح کربلا میں امام حسینؑ تب ہی شہید ہوئے جب کوئی نہ تھا واضح صورت حال یہی تھی کہ اگر آپ تلوار اٹھاتے تو نہ صرف خود شہید ہوتے بلکہ کل سرمایہ ایمان ختم ہو جاتا۔ اور واقعہ کربلا افراد و اشخاص کی

تبدیلی کے ساتھ ۵۰ سال قبل کربلا کے بجائے مدینے میں واقع ہوجاتا اور آسانی سے یہ بات کہی جاتی کہ علیؑ ناحق لڑے اور قتل ہوگئے نتیجہ یہ نکلتا کہ وہ امامت جو اب تک قائم ہے جس کی پوری تاریخ ہے اور جس تاریخ میں حقیقی اسلام کے مکمل خدوخال مل جاتے ہیں۔ آج نہ یہ تاریخ ہوتی اور نہ اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے والا کوئی مذہب موجود ہوتا۔

شہادت عظیم درجہ ہے اور یقیناً اچھی چیز ہے مگر ہر اچھی چیز کے لئے محل اور موقع کا اچھا ہونا بھی ضروری ہے۔

صبح ہجرت اگر پیغمبرؐ شہید ہوجاتے تو حضورؐ کو درجۂ شہادت مل جاتا لیکن آج اسلام نہ ہوتا لہٰذا اللہ نے شہادت کے بجائے نبیؐ کی حفاظت کر کے بتایا کہ اسلام کو نبیؐ کی زندگی کی ضرورت ہے۔

اسی طرح اگر جناب امیر علیہ السلام تلوار اٹھاتے اور قتل ہوجاتے تو آج ایمان اور اس کی تاریخ کا وجود نہ ہوتا۔ وفات آنحضرتؐ کے بعد ایمان کو علیؑ کی زندگی کی ضرورت تھی جس کے لئے آپ نے خاموشی اختیار کی مگر صرف خاموشی نہیں بلکہ حکیمانہ خاموشی جس کے سائے میں ایمان بچا بھی —— اور یوں پروان چڑھا کہ آج تک قائم ہے۔ اور وہ دن بھی انشاء اللہ آئے گا جب علیؑ کا آخری دلبند " واشرقت الارض بنور ربھا " کے مطابق زمین کو اسلام سے جگمگا دے گا۔

غدیر سے اسلامی انقلاب تک

تقریباً ۱۴ سو سال کا طولانی فاصلہ ہے غدیر اور اسلامی انقلاب کے درمیان لیکن اس طویل فاصلہ کے باوجود دونوں واقعے ایک تاریخ سے جڑے ہوئے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ ایک سبب ہے دوسرا اس کا نتیجہ ہے۔ ۱۰ھ کے آخری مہینہ ذی الحجہ کی ۱۸ تاریخ کو مرسل اعظم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے سربراہ اسلام ہونے کا اعلان کیا تھا یہ اعلان حسب ذیل خصوصیات کا حامل ہے۔

۱۔ اعلان سے قبل خدا نے حضورؐ سے کہا کہ اگر یہ اعلان نہ ہوا تو تبلیغ دین کا مقصد فوت ہو جائے گا۔

۲۔ اعلان سے قبل حضورؐ نے اپنی موت کی خبر دی۔ لوگوں کو دین کی پابندی کی تلقین کی۔ حق تبلیغ ادا کرنے کا مجمع سے اقرار لیا۔ لوگوں سے سوال کیا کہ اپنی زندگی کے تم مالک ہو یا میں تمھاری زندگیوں کا مالک ہوں۔ مجمع نے حضورؐ کے مالک ہونے کا اقرار کیا۔ اس اقرار کے بعد لازم تھا کہ حضورؐ اپنی ملکیت (امت کی زندگی) کو نقصان سے محفوظ رکھنے کا انتظام کریں۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ اللہ میرا مولیٰ ہے۔ میں تمھارا مولیٰ ہوں اور جس کا میں مولیٰ ہوں یہ علیؑ بھی

اس کے مولیٰ ہیں -

۳ - اعلان کے بعد خدا نے کہا - آج کافر مسلمانوں کے دین سے مایوس ہوگیا - آج سے کسی غیر اسلامی خوف سے کوئی مسلمان نہ ڈرے کیونکہ آج دین کامل ہوگیا۔ نعمتیں پوری ہوگئیں اور مسلمانوں کا اسلام اللہ نے قبول کیا۔

۴ - اعلان کے بعد حضورؐ نے حکم دیا کہ فرداً فرداً ہر مسلمان سربراہ اسلام ہونے کی مبارکباد حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی خدمت میں پیش کرے -

۵ - اعلان سربراہی کی تقریب کے اختتام کے بعد بھی حضورؐ نے ہر حاضر مسلمان کا فریضہ قرار دیا کہ وہ ہر غیر حاضر مسلمان تک آج کا پیغام - آج کی روئداد - آج کا حکم پہنچائے - چنانچہ ہم ہر سال عید غدیر منا کر اپنے ہادیؐ کی ہدایت پر سالانہ عمل کرتے ہیں -

غدیر کے دن امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے لئے خدا اور نبیؐ نے جو اہتمام کیا - اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام کی ابدیت کو تاقیامت باقی رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ زندگیوں میں نافذ رہے معاشرہ اور حکومت اس کی تابع رہے - قانون الٰہی کو مکمل برتری اور بالاتری حاصل رہے - اور ان مقاصد کے حصول کے لئے لازم تھا کہ معصوم سربراہ مقرر کیا جائے اور اس کی سربراہی سب سے منوائی جائے - غدیری اعلان درحقیقت اسلام کی زندگی کا تحفظ تھا -

اگرچہ تاریخ نے غدیری اعلان سے منہ موڑ لیا تھا مگر سربراہ نے بلکہ پورے سلسلہ سربراہ نے اسلام کا ایسا تحفظ کیا - کہ صدیوں کے نشیب

وفراز بھی اسلام کو ذرہ برابر نقصان نہ پہنچا سکے۔ یہ بات اس وقت اپنی پوری سچائی کے ساتھ سامنے آئی۔ جب غدیر کے معصوم سلسلہ کے زیر اثر ایران میں اسلامی انقلاب آیا۔ اور دنیا نے دیکھا کے اسلام اپنے تمام کلیات وجزئیات سمیت زندہ وتابندہ ہے۔ اسلامی انقلاب نے غدیری اعلان کی اہمیت بھی ثابت کردی اور ائمہؑ نے اسلام کا جو تحفظ کیا تھا اس کا زندہ ثبوت بھی پیش کردیا۔

ایران کے اسلامی انقلاب سے پہلے جن مسلمان ملکوں سے اسلام اور اسلامی حکومت کی آوازیں بلند ہوتی تھیں۔ ان میں سے کسی ملک نے آج تک اپنے یہاں اسلامی حکومت نہیں قائم کی۔ سورہ والناس گواہ ہے کہ انسانوں کا بادشاہ (ملک الناس) صرف خدا ہے کیونکہ اس سورہ کے آغاز میں خدا نے اپنے کو رب الناس۔ ملک الناس الہ الناس بتلایا ہے۔ اللہ کے علاوہ کوئی انسانوں کا خدا نہیں ہے تو اللہ کے علاوہ کوئی نہ انسانوں کا رب ہے نہ انسانوں کا بادشاہ ہے۔ لہذا جہاں حکومت انسانوں کی ہے چاہے وہ ملک کہلاتا ہو یا شیخ۔ صدر کہلاتا ہو یا ڈکٹیٹر وہاں حکومت الہیہ نہیں ہے۔ ایران میں جو دستور رائج ہے اس کی پہلی دفعہ یہ ہے کہ ملک کا ہر قانون اور ہر عہدہ دار قرآن مجید اور ارشاد رسولؐ وارشاد ائمہؑ طاہرین کا پابند ہوگا۔ کوئی کام خلاف کتاب وسنّت معصومینؑ نہ ہوگا۔ ایران کا اسلامی انقلاب جہاں کتاب وسنّت کی حکومت کو نافذ کرتا ہے وہاں سنّت کی تشریح صرف سنّت رسولؐ سے نہیں کرتا ہے بلکہ سنّت معصومینؑ کو سنّت قرار دیتا ہے۔ سنّت کو سنّت رسول وائمہ معصومینؑ قرار دینا اس بات کا

ثبوت ہے کہ اسلامی انقلاب تابع واقعہ غدیر ہے۔

ایران کے اسلامی انقلاب کا دوسرا کارنامہ ہے کہ اس نے لڑنے والے مسلمانوں کو متحد کرنے کی کوشش کی۔ وحدت مسلمین اس انقلاب کا ایک خصوصی ہدف ہے۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ لبنان کی مدد کے لئے کوئی نہ آیا۔ لیکن ایران نے اپنے فوجی دستے بھیج دیئے۔ اسرائیل کے وزیر اعظم نے کسی مسلمان ملک کی طرف توجہ نہ کی لیکن ایران سے کہا کہ وہ اپنی دھمکیوں پر عمل نہ کرے ورنہ خطرناک نتائج پیدا ہوں گے یعنی دشمن کی نظر میں بھی حامی اسلام فقط ایران ہے۔

تیسرا کارنامہ اسلامی انقلاب کا یہ ہے کہ یہاں افراد کی حکومت نہیں ہے۔ آقائے خمینی سب سے زیادہ بااثر ہیں مگر حکومت سے الگ ہیں۔ صدر، وزیر اعظم۔ چیف جسٹس ممبران پارلیمنٹ۔ وزراء۔ جنرل۔ علماء شہید ہوگئے بلکہ ہر گھر تک شہادت پہنچ گئی مگر اسلامی انقلاب کسی گھر سے باہر نہیں ہوا۔

مثبت تبلیغ

بچپنے میں پڑھا تھا کہ ایک بادشاہ نے خواب میں دیکھا کہ اس کے سب دانت گر گئے ہیں۔ صبح اس نے اپنے خواب کی تعبیر پوچھی۔ ایک شخص نے خواب کی تعبیر ان الفاظ میں سنائی کہ آپ کے سب عزیز آپ کے سامنے مر جائیں گے۔ بادشاہ نے اس کو ناراض ہو کر قتل کرا دیا دوسرا شخص آیا اس نے کہا بادشاہ سلامت آپ اپنے تمام عزیزوں سے زیادہ عمر پائیں گے۔ بادشاہ نے اس شخص کا منہ موتیوں سے بھروا دیا۔ یہ واقعہ کتاب میں اس عنوان کے پیش نظر پڑھا تھا کہ بادشاہ کے مزاج کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ ایک ہی بات پر ایک آدمی کو قتل کرا دیتے ہیں اور اسی بات پر دوسرے کا منہ موتیوں سے بھر دیتے ہیں۔ لیکن آج ہمیں یہ واقعہ اس لئے یاد آیا کہ ہمارے سماج میں سوچنے۔ بولنے کے دو دھڑے چل رہے ہیں۔ ایک منفی انداز فکر ہے دوسرا مثبت انداز فکر ہے۔ منفی انداز فکر صرف خرابیاں دیکھتا ہے۔ اس انداز فکر والا ہمیشہ تیز و تند۔ تلخ و ترش لب و لہجہ میں گفتگو کرتا ہے۔ اس انداز فکر والا جلسوں میں شرکت سے گریز کرتا ہے انجمنوں کی ممبری سے انکار کرتا ہے۔ سماجی۔ مذہبی۔ تعلیمی کاموں کا بائیکاٹ کرتا ہے۔

منفی انداز پر سوچنے والے۔ منفی لہجہ میں بولنے والے۔ منفی زندگی بسر کرنے والے خود سکڑتے چلے جاتے ہیں اور دوسروں کو بدمزہ رکھتے ہیں۔ آخر میں ایسے خشک ہو جاتے ہیں کہ پھر کبھی ان کی زندگی میں تازگی۔ بہار خوشی اور خوشگوار

تعلقات کے لمحات آتے ہی نہیں۔ اور سماج ایسی خشک زندگیوں کے خس و خاشاک کی طرف کبھی مڑ کر دیکھتا بھی نہیں۔ یہ مٹ جاتے ہیں کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ یہ مر جاتے ہیں تو خبر موت سننے والے پوچھتے ہیں کیا ابھی تک زندہ تھے لکھنؤ کی ایک قومی شخصیت تھی۔ موصوف تقریباً ہر انجمن۔ ہر ادارہ۔ ہر وقف۔ ہر کانفرنس کے ممبر تھے۔ اور ہر جگہ ممبر ہونا ہی ان کی قومی شخصیت کا ثبوت تھا۔ چنانچہ کبھی کوئی جلسہ ان سے چھوٹا نہیں۔ کورم نہ بھی تب بھی وہ موجود ملتے تھے۔ ملتوی شدہ جلسہ کو قند مکرر سمجھتے تھے اور کبھی شرکت میں کوتاہی نہیں کرتے تھے مگر وہ سر سے پیر تک منفی تھے۔ بولنا۔ سوچنا سب منفی تھا اسی منفی ذہن و فکر و گفتار کی بنا پر صدر جلسہ کے انتخاب سے وہ اختلاف کرنا شروع کرتے تھے۔ اور جلسہ کے ختم ہو جانے کے بعد بھی بیٹھے رہتے تھے تاکہ جو تقریر باقی رہ گئی ہے پورے جلسہ میں نہ سہی باقی ماندہ مجمع میں ہی ہو جائے بعض باتوں کو بار بار کہتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں جلسہ میں ان کی اِن ضروری باتوں پر توجہ نہیں دی گئی تھی۔ حالانکہ لوگ ان کی باتوں پر توجہ ہی نہیں دیتے تھے۔ بلکہ جب وہ بول کر خاموش ہوتے تھے تب لوگ متوجہ ہوتے تھے کہ ہاں اب جلسہ کی کارروائی شروع ہو۔

بہر حال جلسہ برخاست ہونے کے بعد بھی وہ برخاست نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ جلسہ گاہ سے باہر آنے والوں میں وہ سب سے آخری آدمی ہوتے تھے۔ پہلے چھڑی کھڑی کرتے تھے۔ دو ایک بار اسے گھما کر پھر خود کھڑے ہو کر اِدھر اُدھر ایک دو بار گھومتے تھے۔ جب ان کو وہ آنکھیں گھورتی دکھائی دیتی تھیں جو اپنی زبان میں کہتی تھیں اب جاتے ہو یا کمرہ میں تم کو بھی بند کر دیں۔ ان نگاہوں کے بعد وہ ٹھنڈی سانس لے کر چل کھڑے ہوتے تھے۔ ٹھنڈی سانس کس بات پر

لیتے تھے وہ ان ہی کو معلوم تھا۔ لیکن بدگمان طبیعت والوں کا خیال تھا کہ ان کو اس بات کا افسوس نہیں ہوتا تھا کہ ان کی باتیں سنی نہیں گئیں نہ ماننے کا تو خیر کبھی سوال ہی پیدا نہیں ہوا بلکہ افسوس اس کا ہوتا تھا کہ جلسہ ختم ہوگیا۔ خراب لفظوں میں بولنے والے یہ بھی کہہ دیتے تھے کہ افسوس اس پر کرتے تھے کہ لوگ اپنا بھیجا بچا کر کیوں لے گئے۔ کاش ان کے ایسے ہو کر جاتے۔ البتہ کبھی کبھی وہ جلسہ ختم ہونے کے بعد جلدی بھی چلے جاتے تھے۔ مگر یہ اسی وقت ہوتا تھا جب کسی ممبر کا ساتھ ہو جاتا تھا جو ان کے گھر کی طرف جارہا ہو اور اس پر راستہ بھر تقریری چاند ماری کرسکیں۔ اس طرح راستہ بھی طے ہو جاتا۔ اور دل بھی ہلکا ہو جاتا۔ دماغ تو مالک ہی نے ان کو ہلکا دیا تھا۔ اب معلوم نہیں کہ یہ قومی شخصیت زندہ ہے یا مرحوم ہوگئی کیونکہ انھوں نے آخر میں ترک وطن کردیا تھا۔ کردیا تھا بھی غلط ہے بیوی نے گھر والوں سے مل کر ان کو ان کے اس بیٹے کے پاس فارن بھجوا دیا تھا جہاں باپ بیٹے تو درکنار۔ میاں بیوی میں بھی سنڈے ہی سنڈے ملاقات ہوتی تھی۔ سنڈے روز عید بھی تھا اور روز غم بھی۔ جو مل کر ہنستے تھے ان کی عید ہوتی تھی۔ جو ملنے پر لڑتے اور روتے پیٹتے دن گذارتے تھے ان کا یوم غم تھا سنڈے۔ اور ہماری اس قومی شخصیت کو سکوت کے اتھاہ اندھیروں ان کے بیوی بچوں نے پھینک دیا تھا۔ اس سکوت محض سے بڑی سزا ان کو کیا مل سکتی تھی منفی انداز فکر اور منفی رفتار و گفتار نے جہاں گھر میں موصوف کی حالت ناگفتہ بہ بنادی تھی وہاں قومی زندگی میں بھی موصوف کے لیل و نہاریوں گذرتے تھے کہ جلسے میں آئے تو آنے سے پہلے دیکھنے والوں نے ایک دوسرے کو متوجہ کیا کہ...... صاحب آگئے۔ اور جب آگئے تو آئیے۔ آئیے کی مکرر آوازوں سے استقبال ہوتا تھا۔ اس

استفسار استقبال کے بعد لوگ محظوظ ہونا شروع کر دیتے تھے مجمع کے محظوظ ہونے کا سلسلہ اس وقت ٹوٹتا تھا جب جلسہ شروع ہوتا تھا۔ اور جلسہ شروع ہوتے ہی موصوف کے محظوظ ہونے اور مجمع کے بور ہونے کا دور شروع ہو جاتا تھا موصوف سے کبھی کہا جاتا۔ آپ کو بولنے کا موقع ملے گا۔ ابھی جلسہ ہو جانے دیجیے۔ کبھی کہا جاتا کہ ذرا رک جائے کام کی باتیں ہو جائیں پھر بولئے گا۔ صدر جلسہ کو مسلسل صدارت کرنا پڑتی تھی ورنہ اکثر صدر۔ جلسہ میں سو بھی لیتے ہیں۔ کیونکہ موصوف کے صدر کو بار بار موصوف سے کہنا پڑتا بیٹھ جائیے۔ میں آپ کو بولنے کی اجازت نہیں دیتا ہوں۔ موضوع پر بولئے۔ آپس میں تو تو میں میں نہ کیجئے وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال جلسہ پرشور رہتا۔ ایک بار بعض شوخ ممبروں نے موصوف کو گھیرے میں لے لیا جلسہ بھر باتوں میں لگائے رکھا۔ صدر کی مخصوص ہدایت پر یہ عمل خاص ہو رہا تھا کیونکہ جلسہ میں اہم امور کم وقت میں طے کرنا تھے چنانچہ صدر جلسہ نے جب ایجنڈے کے ختم ہونے کا اعلان کیا تو موصوف سے کہا۔ ہاں جناب اب آپ کی سالانہ تقریر ہونا چاہیے۔ مگر حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ موصوف نے طے کیا کہ اس سال کی اور اگلے سال کی دونوں تقریریں اگلے سالانہ جلسہ میں ایک ساتھ ہوں گی۔ موصوف کے ایک قدر دان کے سامنے موصوف کا ذکر ہوا تو قدر دان نے کہا۔ جی ہاں فلاں صاحب۔ بس ان کو تو کوئی بات اچھی لگتی ہی نہیں ہے۔

یہ تھا موصوف کے فکر و گفتار و رفتار کے منفی انداز کا نتیجہ۔ موصوف کے ذکر نے طول کھینچا۔ معلوم نہیں پڑھنے والوں میں کون موصوف کے اس ذکر طویل سے محظوظ ہوگا اور کون بور ہوگا البتہ یہ ضرور ہوا کہ ذکر موصوف میں ہم اس واقعہ کو بھول گئے جس سے ہم نے مضمون شروع کیا تھا حالانکہ یہ واقعہ اسی لئے

یاد آیا تھا کہ ایک خواب کی ایک ہی تعبیر دونوں نجومیوں نے بیان کی تھی کہ بادشاہ کے سب عزیز اس کے سامنے مر جائیں گے مگر منفی لب ولہجہ میں بولنے والے نے سب کے مرنے کی خبر دی تو خود ہی سب سے پہلے مر گیا اور دوسرے مثبت لب ولہجہ میں بولنے والے کے بادشاہ کی زندگی سب عزیزوں کی زندگی سے طولانی بتایا وہ بھی زندہ رہا۔ اس کی تعبیر بھی زندہ رہی۔ یہ واقعہ مثبت اور منفی لب ولہجہ کے فرق سمجھنے کے لئے بڑا مفید واقعہ ہے ہم کو اپنی گھریلو زندگی میں۔ کاروباری زندگی میں۔ معاملاتی زندگی میں۔ تعلقاتی زندگی میں اپنے اعزا اپنے احباب۔ اپنے ملاقاتیوں اور پڑوسیوں بلکہ بس اور ریل میں ساتھ ہو جانے والوں کے ساتھ ہمیشہ مثبت رخ اختیار کرنا چاہیئے۔ بلکہ سڑک پر جن کے قریب سے گذرنا ہے یا جو ہمارے قریب ہو کر گذرنے والے ہیں ان سے بھی مثبت برتاؤ کرنا چاہیئے۔ اندھے ہو۔ دیکھتے نہیں ہو منفی لہجہ ہے۔ بھائی ذرا دیکھ کر چلو مثبت لہجہ ہے۔ ہم بھی بیٹھیں گے کہا آپ نے ریل خرید لی ہے۔ منفی لہجہ ہے۔ بھائیوں کیا ہمیں بھی تھوڑی بہت جگہ مل سکتی ہے۔ مثبت انداز گفتگو ہے۔ آپ کو پڑوسی ہو کر ہمارا خیال نہیں۔ منفی رخ ہے۔ ہم کو اپنے پڑوسی کے بارے میں اطمینان ہے کہ وہ ہم کو نہ بھولیں گے۔ مثبت رخ ہے۔ آپ بھی آدھمکے منفی رخ ہے۔ اچھا آپ بھی آگئے۔ آیئے آیئے۔ مثبت رخ ہے۔ دوست ایسے نہیں ہوتے جیسے تم ہو۔ منفی رخ ہے آپ دوستی کا حق نبھائیں گے ہم آپ کے بارے میں بھی یقین رکھتے تھے۔ مثبت رخ ہے۔ شادی میں نہ بلایا تب ہم عزیز نہ تھے اب قرض مانگنے آئے ہو تو عزیز داری جتاتے ہو۔ یہ منفی رخ ہے۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ شادی کا دعوت نامہ نہ دینے کے بعد آپ ہم کو بھول جائیں گے مگر خیر قرض ہی ملاقات کا ذریعہ بن گیا۔ کہیے کیا ضرورت ہے۔ مثبت رخ ہے تم کو کھانا پکانا نہیں آتا۔

گھر سلیقہ سے چلانا نہیں آتا ۔ منفی رخ ہے ۔ اب رفتہ رفتہ تمہارے ہاتھ کے کھانے میں مزہ بڑھتا جا رہا ہے ۔ اب گھر کی بدسلیقی گھٹنے لگی ہے مثبت رخ ۔ مثالوں کی کمی نہیں مگر منفی ۔ مثبت کے تقابل میں کہیں ہم آپ ایک دوسرے کے منفی نہ ہو جائیں لہٰذا تمہید ختم اور مقصد حاضر ۔ کہ تبلیغ کے بھی دو رخ ہیں ۔ جہنم میں جاؤ گے ۔ جنت کا منہ نہیں دیکھ سکو گے منفی انداز تبلیغ ہے ۔ جہنم سے بچو ۔ جنت ہاتھ سے جانے نہ پائے مثبت انداز تبلیغ ہے ۔ ہمارے مقررین کو ہمارے اہل قلم کو ہمارے شاعروں اور دانشوروں کو ہمارے علماء و طلاب کو مثبت انداز تبلیغ اپنانا چاہیئے ۔ ضرورت ہے کہ بے دینی کے نقصانات کی عملی زندگی میں نشاندہی کی جائے ۔ مثلاً مہر کو نہ دیا جانے والا قرض ہٹا دیا گیا ہے اور زائد سے زائد جہیز کو نقد بلکہ پیشگی وصول کرنے کا مزاج پیدا کر دیا گیا ہے ۔ اس طرح سماج نے اپنے ہاتھوں اپنے گلے میں مشکلات کی پھانسی کا پھندا ڈال لیا ہے ۔ تختہ کھینچا جا چکا ہے ۔ قوم کی بیٹی کی لاش لٹک رہی ہے ۔ سمدھیانہ کے گدھ لاش کے ارد گرد منڈلا رہے ہیں ۔ حل صرف دین کی پابندی میں ہے کیونکہ مہر کا ادا کرنا واجب ہے بلکہ نقد ادا کرنا واجب ہے ۔ قرض مہر کے لئے بیوی کی رضامندی ضروری ہے ۔ رضامندی رواجی دباؤ سے نہیں حاصل کرنا چاہیئے ۔ کیونکہ رضامندی اختیار کا نام ہے ۔ اگر مہر نقد ادا کیا جانے لگے اور ہمارا سماج یہ جان لے کہ دباؤ ڈال کر زیادہ مہر منوانا یا جہیز طلب کرنا حرام ہے اور دباؤ سے ملنے والا مال بھی حرام ہے ۔ بیٹی جہیز کی مالک ہے داماد مالک نہیں ہے ۔ سمدھی یا سمدھن کے حقوق کی شریعت کے ان احکام سے باخبر ہو جائے گا تو اسے خود بخود بے دینی سے نفرت پیدا ہو گی اور دین سے قربت پیدا ہو گی ۔

حضورؐ نے اسی مثبت تبلیغ کی طرف رہنمائی فرمائی

بارگاہ میں اپنے دشمنوں کے لئے دعا کی تھی۔ مالک ان کو ہدایت دے ناواقف ہونے کی وجہ کی بنا پر مجھ پر ظلم کر رہے ہیں۔ تو آج بھی ضرورت ہے کہ جوانوں کو خاص طور پر دینی تعلیم دی جائے۔ دینی ماحول فراہم کیا جائے۔ ان کے مشکلات کے دینی حل بتائے جائیں ان کی امنگوں کو دینی تمناؤں سے سنوارا جائے تو تبلیغ بے حد کامیاب ہوگی۔ اس کے برخلاف منفی تبلیغ ضد اور نفرت اور مذہب سے دوری پیدا کرتی ہے۔

مہدی

یعنی یکساں انسانی نظام کو عالمی حکومت کے ذریعہ نافذ کرنے والا آفاقی رہبر۔

وجود کے اعتبار سے چیزوں کی تین عقلی قسمیں ہیں۔

پہلی قسم وہ ہے جو وجود ہی وجود ہے۔ عدم کا شائبہ بھی اس میں شامل نہیں ہے۔ اس کے وجود میں نہ ہونے کا کسی طرح کا کوئی تصور نہیں پایا جا سکتا۔ ایسے کو واجب الوجود کہتے ہیں جو صرف خدا ہے خدا کے علاوہ کوئی واجب الوجود نہیں ہے۔

دوسری قسم وہ ہے جو عدم ہی عدم ہے۔ وجود کا شائبہ بھی اس کے تصور میں داخل و شامل نہیں ہو سکتا۔ وہ نہ تھا نہ ہے۔ نہ ہوگا اور نہ ہو سکتا ہے۔ ایسے کو محال کہتے ہیں جیسے خدا کا شریک اور اس کے کمالات و اختیارات کا ساتھی اور ساجھی جو محال اور صرف محال ہے مثلاً خدا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اس کی اس ایک صفت میں بھی کوئی اس کا ساتھی اور ساجھی نہیں ہو سکتا۔ سوال ہو سکتا ہے کہ خدا اپنا شریک پیدا کرنے پر قادر ہے یا نہیں تو جواب یہی ہے کہ جو پیدا ہوگا وہ قدیم نہ ہوگا۔ نہ تھا تب ہی پیدا ہوا اور جو نہ تھا وہ اس کا ساتھی کیسے بنے گا جو ہمیشہ سے ہے۔

تیسری قسم وہ ہے جو عدم اور وجود دونوں کا مجموعہ ہے۔ کل نہ تھا۔

آج ہے اور کل نہ رہے گا اس کے وجود میں ہونا نہ ہونا دونوں شامل ہیں۔ ایسے کو ممکن کہتے ہیں۔ خدا کے علاوہ جو کچھ تھا۔ جو کچھ ہے۔ جو کچھ ہوگا سب ممکن ہے۔ چونکہ ممکن میں وجود و عدم۔ ہونا اور نہ ہونا دونوں شامل ہیں لہٰذا ساری دنیا کی ہر چیز میں بناؤ اور بگاڑ تعمیر و تخریب کا سلسلہ جاری رہے گا۔ ہمارے جسم میں ہر سکنڈ کچھ بنتا بھی ہے اور کچھ مٹتا بھی ہے۔ جسم میں ہوا۔ پانی۔ غذا جو چیز بھی داخل ہوتی ہے ان سے کچھ نہ کچھ بنتا ہی رہتا ہے اور آدمی چاہے بالکل بے حس پڑا سوتا رہے تب بھی اس کے جسم کی بہت سی چیزیں خود بخود جل کر۔ چل کر۔ گھس کر ختم ہوتی ہی رہتی ہیں۔

جب بناؤ اور تعمیر کا حصہ زیادہ ہوتا ہے تو جسم اور توانائی وانرجی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور جسم بڑا ہوتا ہے قوی ہوتا ہے۔ جب بگاڑ اور تخریب کا حصہ زیادہ ہوتا ہے تو جسم دبلا پتلا ہوتا جاتا ہے کمزوری بڑھتی جاتی ہے۔ بناؤ کے ذریعہ پیدائش ہوتی ہے۔ جوانی آتی ہے۔ بگاڑ کے ذریعہ بڑھاپا آتا ہے اور موت آتی ہے۔ کچھ ہمارے جسم پر منحصر نہیں پتھر پہاڑ۔ دریا۔ سمندر درخت اور جانور سب کا یہی حال ہے اور زمین۔ چاند۔ سورج سب کا یہی حال چل رہا ہے۔ جس دن سب کمزور ہوں گے وہی دن دنیا کی موت یعنی قیامت کا دن ہوگا۔

غرضکہ اس کائنات میں بناؤ اور بگاڑ۔ تعمیر و تخریب سب ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ لہٰذا انسان کی زندگی اور زندگی کے ساتھیوں کے درمیان بھی یہی تعمیر و تخریب کا عمل جاری ہے۔ کسی کی ترقی سے دوسرا کمزور ہوتا ہے۔ کسی کی قوت اُس کے لئے باعث اطمینان ہوتی ہے تو اسی کی یہی قوت دوسرے کو خوفزدہ کرتی ہے۔ ترقی و اطمینان کے

پہلو بہ پہلو کمزوری اور خوف کا وہ سلسلہ جاری ہے جس کی نہ کوئی حد ہے نہ انتہا۔ اس لئے اقوام متحدہ میں سب ایک دوسرے سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ سب ایک دوسرے کو بیوقوف بنا کر اپنا الو سیدھا کرتے رہتے ہیں۔ جس طرح گھوڑا گھاس کھاتے وقت سوچ سکتا ہے کہ مالک بے وقوف ہے جو ہمیں کھلا رہا ہے۔ لیکن جب مالک لگام چڑھاتا ہے تب پتہ چلتا ہے کہ گھاس کھا کر آزادی کھو دی ہے۔ گھاس کی قیمت سواری دینے اور بوجھ ڈھونے چابک کھانے اور مرضی کے خلاف دوڑنے کی صورت میں ادا ہو رہی ہے۔ اقوام متحدہ میں بھی گھاس کھانے کھلانے۔ سواری دینے اور سواری لینے کا سلسلہ جاری ہے۔ مہلک اسلحہ کی برق رفتار ترقی عہد حاضر کے انسان کی مشکلوں کے عروج و انتہا کو واضح کر رہی ہے ۔ انسانی مشکلوں کا واحد حل ہے عالمی حکومت۔ آفاقی رہبر۔ سارے انسانوں کے لئے یکساں نظام زندگی مگر جب تک سماج کی شکل و صورت پیاز جیسی ہے کہ تلے اوپر چھلکے ایک دوسرے سے چپکے بھی ہیں مگر سب سے ملے بھی ہیں اور سب جدا بھی ہیں تب تک اس پیازی سماج سے انسانیت کی آنکھوں سے آنسو ہی بہتے رہیں گے اور جلن ہی جلن ملے گی۔ آج جب دنیا بہت سے ملکوں میں تقسیم ہے۔ ہر ملک صوبوں میں بٹا ہے۔ ہر صوبہ طبقاتیت۔ فرقہ واریت ذات پات نسل و رنگ کے اختلافات۔ فسادات۔ تشدد کا شکار رہے تو سچی تصویر یہی ہے کہ سب سے بھی ہیں اور سب سے جدا بھی ہیں۔ اختلافات کی پیازی بدبو بھی ہے اور آدمیت شدید گھٹن اور جلن میں مبتلا بھی ہے۔

علاج یہی ہے کہ پیازی سماج سمندری سماج بن جائے کہ ہر خطرہ کا پرنالے۔ ندی کا اپنا ذاتی وجود بھی باقی رہے اور سب سمندر میں شامل بھی

رہیں ۔انسانوں میں خوشیوں کی لہریں ہوں ۔سب موج میں بھی رہیں اور موجزن بھی رہیں مگر قطرہ کو سمندر میں شامل کرنے والا نظام بھی چاہیئے ۔ آفاقی رہبر بھی چاہیئے ۔اور اس نظام کو نافذ کرنے والی عالمی حکومت بھی چاہیئے ۔انسانی خوشبوں کا یہ خواب انسانی عقل صدیوں سے دیکھ رہی ہے۔ ہر مذہب اس خوش کن تصور کو ہزاروں سال سے پیش کر رہا ہے اسلام نے مہدیؑ کی شکل میں اس تصور کے خدوخال پیش کئے ہیں اور عقیدہ امامت والے مسلمان مہدیؑ سے متعلق تمام تفصیلات بھی جانتے ہیں ۔ ماقبل مہدی ۔ وجود مہدیؑ ۔ظہور مہدیؑ ۔ وقت ظہور مہدی ۔ مابعد ظہور مہدیؑ ۔ مابعد مہدیؑ غرضکہ ہر عہد کے حالات کا علم ان کو ان کے رہبروں کے ذریعہ حاصل ہے۔ جسے علماء نے کتابوں میں مرتب کر کے پیش کیا ہے ۔اور پیش کر رہے ہیں۔

اللہ کا شکر ہے کہ نظریہ کتابوں سے باہر آچکا ہے ۔ اسلامی انقلاب کی صورت میں اس کا آغاز ہو چکا ہے ۔ عادل ۔ عالم ۔ شریف ۔ رحم دل عالمی حکومت کا نمونہ پیش ہو چکا ہے ۔ ہزاروں رکاوٹوں کے باوجود مسلمان متوجہ ہو رہے ہیں اور ساری دنیا کے کمزور اس کے گرد جمع ہو رہے ہیں ۔ رہے ساری دنیا کے مغرور ۔ظالم ۔ بے رحم ۔ لوٹ کھسوٹ کرنے والے قاتل اور ڈاکو قانون و حکومت و تہذیب کے تلے جمع ہو رہے جس طرح چراغ تلے اندھیرا ہوتا ہے ۔

مگر انسانی دکھوں کی موت کا وقت قریب ہو چکا ہے یعنی ہر ظالم کی موت قریب ہے اور انسانی خوشیوں کا دور شروع ہو چکا ہے ۔آدمیت نے اطمینان کے سانس لینا شروع کر دیے ہیں ۔

شک گھیرے رہے گا کہ وظیفہ نہیں پورا ہوا کہیں آج کوئی نقصان نہ ہو جائے۔ کوئی کام نہ بگڑ جائے۔ کوئی بلا نہ آجائے حالانکہ اول تو دنیا عمل کی جگہ ہے جزا اور سزا کی جگہ نہیں ہے۔ پھر رحیم و کریم خدا بندوں سے زیادہ اپنے بندے کی مجبوری کو جانتا ہے اور نظر کرم کرتا ہے۔ جب بندے مجبوری کے ایسے موقع پر رحم کرتے ہیں تو مالک کرم کیوں نہ کرے گا۔ تصور بلاء نقصان بھی وسوسہ شیطانی اور البیسی اور اندیشہ غیر اسلامی ہے۔

حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے اسی لئے فرمایا ہے کہ عبادت کرو یعنی ہر کام صرف حکم خدا کے مطابق کرو اور صرف اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کرو۔ عبادت کو عادت نہ بناؤ ورنہ اپنی تسکین کے لئے جو کام کرو گے وہ قربتہ الی اللہ نہ ہوگا لہٰذا یاد رکھو عادت عبادت نہیں ہے۔

اس لئے عبادت کرو۔ عبادت کو عادت نہ بناؤ۔

تعلیم اور ملازمت

ڈارون بندر سے آدمی نہ پیدا کر سکا۔ البتہ غلط و احمقانہ نظریات پیش کرنے والے فلسفیوں کی صف اول میں جا کھڑا ہوا۔ لیکن خدائے قادر نے آدمیوں کو جناب آدمؑ سے اور آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا۔ اور اس مٹی سے انسان کے علاوہ جانور بھی پیدا کئے۔ دونوں کو الگ صنف قرار دیا۔ لیکن مٹی نے اپنا زور دکھایا انسانوں میں جانوروں کے اوصاف کی جھلک آگئی اور جانوروں میں انسانی خصائل کا جلوہ دکھائی دینے لگا جہاں جانوروں میں انسانی ذہانت کے نشانات ملتے ہیں وہاں انسانوں میں جانوروں کی بے عقلی کے مقامات بھی ملتے ہیں۔ بے وقوفی۔ حماقت، بے حسی۔ یہ تین جانور بلند رتبہ کے مالک ہیں جن کو لوگ گدھا۔ بھیڑ اور بھینس کہتے ہیں۔ گدھا ضرب المثل ہے۔ بھیڑ نامور ہے بھینس اپنا جواب آپ ہے۔ انسانوں میں بھی ان جانوروں کے نمائندے پائے جاتے ہیں۔ جیٹھ بیساکھ میں موٹا ہونا اور ساون بھادوں میں دبلا ہونا گدھے کے لئے مشہور ہے لیکن انسانوں میں بھی ایسے نہیں جن کو روزی کے لئے کام کرنا پڑتا ہے تو اپنے کو دکھی محسوس کرتے ہیں اور جب بیکاری میں فاقے کرتے ہیں تو چارپائی کے بان توڑ کر اپنے کو سکھی محسوس کرتے ہیں اگر بھینس کسی کو کچل دے اور کسی سے اس کا جسم چھل جائے ان فکروں

جلد بازی ایک عیب ہے جو زندگی کے اکثر مواقع پر اکثر افراد میں دیکھا جاتا ہے۔ کبھی کبھی یہ جلد بازی علمی دنیا میں بھی آجاتی ہے اور لوگ سمجھنے میں جلد بازی کرنے لگتے ہیں۔ افہام و تفہیم کے جلد باز اکثر آیات و احادیث کا غلط مفہوم سمجھ بیٹھتے ہیں اور جو سمجھ بیٹھتے ہیں پھر اسی پر جمے رہنا چاہتے ہیں۔ بلکہ دوسروں سے اسے منوانا بھی چاہتے ہیں۔ شاید اپنی زود فہمی کا حق سمجھتے ہیں کہ جو انھوں نے سمجھ لیا ہے وہی سب سمجھ لیں۔ چنانچہ میں نے ثواب زیارتِ امام حسینؑ کے سلسلہ کی حدیثوں کے زود فہموں کو دو طرفہ غلطیوں کا شکار دیکھا ہے۔ کچھ کے خیال میں ثواب زیادہ بیان کر دیا گیا ہے۔ ان کے خیال میں ایک زیارت کا ثواب سینکڑوں بلکہ ہزاروں حج اور عمرہ کے ثواب کے برابر نہیں ہو سکتا ہے۔ کچھ دوسرے ہیں جن کے خیال میں ثواب زیارت کے پیش نظر فریضۂ حج کی ادائیگی کی ضرورت نہیں رہ جاتی ہے۔ ایک کو ثواب زیارت کا انکار ہے۔ دوسرے زیارت کے نام پر واجب حج سے چھٹکارا حاصل کرنے کا راستہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

جب کہ صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ واجب وہ کام ہے جس کے کرنے والے کو ثواب ملتا ہے اور نہ کرنے والے کو عذاب ہوتا ہے اور مستحب وہ کام ہے جس کے کرنے والے کو ثواب ملتا ہے مگر نہ کرنے والے کو عذاب نہیں ہوتا ہے حج زندگی میں صرف ایک بار واجب ہوتا بشرطیکہ شرائط پورے ہو جائیں۔ اس کے بعد ساری زندگی کے سارے حج مستحب ہیں۔ اور زیارتیں تمام کی تمام مستحب ہیں۔

مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمیشہ ہر مستحب کام کا ثواب واجب کام سے زیادہ ہوتا ہے جس طرح ترازو کے ایک پلہ میں وزن اور باٹ ہوتا ہے جس سے تولا

جاتا ہے اور دوسرے پلہ میں وہ سامان ہوتا ہے جسے بانٹ کے ذریعے تولا جاتا ہے مثلاً یہ چیز پانچ کلو ہے، پچاس کلو ہے، ہزار کلو ہے ایک لاکھ کوئنٹل ہے اس کا وزن کلو ہی سے معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح واجب کام کا ثواب وزن اور بانٹ کا کام دیتا ہے۔ مستحب کام کا ثواب واجب کام کے ثواب کے ذریعہ ہی بیان ہوتا ہے۔ اسی لئے زیارت کا ثواب سینکڑوں بلکہ ہزاروں حج اور عمرہ کے ثواب کے برابر بیان ہوا ہے کم اور زیادہ ثواب کی بنیاد زیارت کرنے والے کے عمل کے وزن کا فرق ہے اس بات کے سمجھنے میں کہ واجب کام سے مستحب کام کا ثواب زیادہ ہوتا ہے اس مثال سے مدد ملے گی کہ ہر ملازم کو اپنی ملازمت کے فرائض ادا کرنا ضروری ہوتے ہیں مگر اوورٹائم کرنا اس کے فرائض میں نہیں ہوتا ہے البتہ اوورٹائم کی شرح تنخواہ کی شرح سے زیادہ ہوتی ہے۔ لہٰذا کسی عقیل وفہیم انسان کو ثواب زیارت کے زیادہ ہونے کا غلط اور عبث خیال نہیں پیدا ہونا چاہیئے۔

اسی مثال میں دوسری غلط فہمی کا جواب بھی موجود ہے کہ اوورٹائم صرف اس کو ملتا ہے جو ڈیوٹی پر حاضر ہوتا ہے۔ غیر حاضر کو اوورٹائم نہیں ملتا ہے اسی طرح مستحبات کا ثواب اسی وقت ملتا ہے جب مستحب اعمال قبول ہوجائیں اور قرآنِ مجید میں نص صریح موجود ہے کہ صرف پرہیزگاروں کے اعمال اللہ قبول کرتا ہے۔ اور ظاہر ہے واجبات کو ترک کرنے والا ہرگز متقی نہیں ہوسکتا ہے۔ ہر باعمل شخص باخبر ہے کہ اگر ایک وقت میں واجب اور مستحب کام میں سے صرف کسی ایک کا بجا لانا ممکن ہو تو واجب کو ترک نہیں کیا جائے گا۔ اگرچہ رحمٰن ورحیم خدا نے مستحب کاموں کا ثواب زیادہ رکھا ہے کیوں کہ واجب کام بندہ حکم خدا کی بناء پر کرتا ہے اور مستحب کام خود کرتا ہے تاکہ خدا کی خوشنودی زیادہ

حاصل کر سکے۔ ہم کو بھی مذہب نے یہی تعلیم دی ہے۔ کہ اگر کوئی شخص تم پر اعتماد کرتا ہے تو حتیٰ الامکان اس کے اعتماد کو پورا کرو تاکہ اس کی توقعات کو ٹھیس نہ لگے۔ جب بندوں کو یہ ہدایت ہے تو خدا کیسے اپنے بندے کے اعتماد کو ٹھیس پہنچے دے گا۔ بندہ مستحب کو انجام دے کر خدا کی زیادہ سے زیادہ خوشنودی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا خدا زیادہ سے زیادہ ثواب دے کر بندے کی توقع کو پورا کرنا چاہتا ہے۔ غرض کہ نہ کوئی بندہ خدا کی نافرمانی کے لئے کسی حکم خدا کو ذرائع بنا سکتا ہے۔ اور نہ کسی بندے کو خدا کی دادودہش پر حق اعتراض ہے۔ لہٰذا جو ثوابِ زیارت بیان ہوا ہے وہ درست ہے۔ بجائے بحث کرنے کے اس ثواب کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے اور عادت ڈالنا چاہیئے کہ واجبات ادا ہوں۔ گناہوں سے پرہیز رہے تاکہ اعمال قبول ہوں۔ ضائع نہ ہوں۔ تقویٰ پیدا کرنے کی مہم میں لگ جانا چاہیے۔ بحث میں اپنے کو ضائع نہ کرنا چاہیئے۔

زیارت امامِ حسینؑ کے سلسلہ میں چند نمایاں امور کا تذکرہ مفاتیح الجنان سے بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ ثوابِ زیارت، حج، عمرہ، جہاد سے بدرجہا زیادہ ہے۔ زیارت باعث مغفرت ہے، سبب آسانی حساب روزِ محشر ہے بلندئی درجات کا ذریعہ ہے۔ دعا قبول ہونے کا وسیلہ ہے زیادتی عمر و روزی اور حفاظتِ جان و مال اور حاجت برآری رنج و غم کے دور کرنے کا سبب ہے۔ زیارت کا کم سے کم ثواب یہ ہے کہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

۲۔ زیارت نہ کرنا جب کہ ممکن ہو یا دل کا آرزوئے زیارت سے خالی ہونا دین و ایمان کا نقص ہے اور حقوق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

میں سے ایک بہت بڑے حق کا ضائع کرنا اور ادا نہ کرنا ہے۔

۳۔ جو شخص سفر زیارت پر روانہ ہونے کا ارادہ کرے وہ روانگی سے قبل تین روزہ رکھے اور تیسرے روز غسل کرکے اپنے اہل وعیال کو رخصت کرے۔

۴۔ گھر سے نکلے تو ذکرِ خدا اس کی زبان پر جاری ہو۔

۵۔ جس طرح حضرت امام حسینؑ بھوکے، پیاسے، غبار آلودہ، غمناک شہید ہوئے ہیں۔ زائر کو اسی حالت میں زیارت کے لئے حاضر ہونا چاہیئے۔ اور زیارت کرکے وطن واپس ہونا چاہیئے۔ کربلاء معلیٰ کو وطن نہیں بنانا چاہیئے۔

۶۔ سفر میں سادے کھانے کھائے۔ لذیز کھانوں کی طرف متوجہ نہ ہو۔

۷۔ ساتھیوں کے ساتھ محبت سے پیش آئے۔ مجبور اور تھکے افراد کی خدمت کرے۔ ایسا سفر نہ کرے جس سے شان اور تکبر واضح ہوتا ہو۔

۸۔ زیارت سے قبل تسبیح۔ ذکر خدا، دُعائیں جو منقول ہیں پڑھے زیارت کے بعد کم از کم دو رکعت نماز پڑھے ورنہ جس قدر زیادہ نمازیں ممکن ہوں پڑھے۔ روزانہ واجب اور سنّتی نمازیں حرم میں پڑھے۔

ان چند امور سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ زیارتِ امامِ حسین علیہ السلام کردار سازی کا بہترین ذریعہ ہے۔ مہربان خدا نے ہم کو یہ آسانی بھی دی ہے جو حرم میں حاضر نہ ہوسکے وہ جہاں ہو وہاں سے زیارت کرے اور منقول زیارتیں پڑھے۔ ہم حرم میں ہوں یا دور سے زیارت پڑھیں ضریح اقدس کو بوسہ دیں یا امام بارگاہوں میں حاضری دیں ہم کو

راستے کو صحیح سمجھو۔ یہ اصول صرف اصول ہی نہیں بلکہ تاریخ میں اسے پرکھا جا چکا ہے اور اسی معیار پر عظیم فیصلے کئے جا چکے ہیں۔ مباہلہ میں آنحضرتؐ کی فتح اور نصاریٰ کی شکست اسی اصول کے ماتحت ہوئی تھی ورنہ مقابلہ تو ہوا ہی نہ تھا کیونکہ نصاریٰ نے طے کیا تھا کہ اگر اسلام سچا مذہب نہیں بلکہ اقتدار کا ڈھونگ ہے تو نبیؐ مباہلہ کے میدان میں ہلاکت کے خیال سے خوفزدہ ہوں گے اور فطری تقاضے کے ماتحت اپنوں کو بچا کر غیروں کو اپنے سیاسی اغراض پر بھینٹ کریں گے برخلاف اس کے اگر اسلام واقعی سچا مذہب ہے تو نبیؐ بے خوف ہوں گے لہٰذا غیروں کو لانے کے بجائے اپنوں کو لائیں گے۔ جب مباہلہ میں کوئی "غیر" حاضر نہ تھا اور نبیؐ کا کوئی "اپنا" غیر حاضر نہ تھا تو نصاریٰ کو یقین کرنا پڑا کہ اسلام سچا مذہب اور بانی اسلام کو خود اپنے مذہب پر اعتماد کامل ہے۔ یہ ایسی خود اعتمادی تھی جس نے نصاریٰ کے اعتماد مذہبی کو منہدم کر دیا نہ صرف منہدم کر دیا بلکہ مجبور کر دیا کہ یا تو حق کا اقرار کیا جائے یا جزیہ کی عریاں شکست کو تسلیم کر لیا جائے نصاریٰ نے اپنے سیاسی مقاصد کے لیے دوسری راہ اختیار کی اور نبیؐ نے اس کو قبول کر لیا کیونکہ ہادی کا کام باطل کو عریاں اور حق کو روشن کرنا ہے جو حاصل ہو چکا تھا رہا کلمۂ حق پڑھنے پر مجبور کرنا نبیؐ نے اس پر اصرار نہ کیا کہ مباہلہ کرو یا مسلمان ہو جاؤ کیونکہ مجبور کرنا نہ دین میں جائز ہے نہ جبر دین بن سکتا ہے۔

مذہب پر خود مذہب کے میر کارواں کو یقین ہے یا نہیں اسی اصول کو عملی طور پر پیش کرنے کے لئے جناب ابراہیمؑ سے قربانی کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور خلیل مطالبہ محبوب کو پورا بھی کر دیتے ہیں، بلکہ مطالبہ بھی صرف خواب میں ہوا تھا مگر خلیل نے خواب کو صرف ایک خیال نہیں قرار دیا بلکہ حقیقت بنا دیا۔ خدا کبھی اپنے لئے انسانی گلے کو کٹنا منظور نہیں کرتا لہٰذا ذبح کرنا جناب ابراہیم کا

کام تھا اور فدیہ بھیجنا خدا کا فرض تھا۔

اس واقعہ کے بعد یہ تو ممکن ہے کہ کوئی خدا کے وجود کا اقرار نہ کرے گا مگر جناب ابراہیمؑ خدا کو نہیں مانتے تھے یہ کہنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔

مسلمانوں میں آنحضرتؐ کی شخصیت پر اتحاد نظر کے بعد جو مذہبی اختلافات پائے جاتے ہیں اور جن کو فرقہ کی شکل میں شیعہ اور سنی میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور کوئی مسلمان چاہتا ہے کہ ان اختلافات میں حق و باطل کو پہچان لے تو اس کے لئے بھی یہی راستہ ہے کہ وہ دیکھے سنی عقیدہ جن شخصیتوں سے وابستہ ہے وہ شخصیتیں موت کے وقت اپنے کو اندھیرے میں گھرا پاتی ہیں یا اجالے میں دیکھتی ہیں اور شیعہ عقیدہ جن شخصیتوں سے لپٹا ہوا ہے وہ حضرات موت کے وقت تاریکی میں ہیں یا روشنی میں۔ موت حقیقت بھی اور حقیقت کی طرف راہ نما بھی ہے۔ جب آخرت کا سفر شروع ہو تو دیکھو کون کس حال میں آغاز سفر کر رہا ہے اور اسی حالت کو دیکھ کر طے کرو ہم کو کس کا راستہ اختیار کرنا چاہئے اب آپ کے سامنے صرف حضرات اہلسنت کی کتابوں سے ان کا ذکر پیش کیا جاتا ہے جن کی شام زندگی میں اندھیرے ہیں۔

طبری جلد ۴ صـ ۵۲ حالات ۱۳ھ میں درج ہے" ان ابا بکر الصدیق قال فی مرض موته وددت انی لم اکشف بیت فاطمه عن شیئ وان کانوا قد خلقوه علی الحرب وددت انی یوم سقیفه کنت قذفت مالامی فی عنق احد الرجلین یرید عمر وا باعبیدة

(ترجمہ) ابوبکر صدیق وفت کہتے تھے کاش میں نے فاطمہ کے دروازے کو نہ توڑا ہوتا چاہے ان لوگوں نے مجھ سے جنگ کرنے کے خیال ہی سے کیوں نہ دروازہ بند کیا ہوتا...... کاش سقیفہ کے دن (جس دن ابوبکر خلیفہ بنائے

گئے تھے) میں نے خود خلافت قبول کرنے کے بجائے عمر یا ابوعبیدہ کسی ایک کی گردن پر یہ جوا رکھ دیا ہوتا۔

وقت موت خلیفۂ اوّل مسرور و مطمئن نہیں ہیں کہ انھوں نے زندگی صحیح مقاصد اور صحیح طرز عمل پر گذاری بلکہ رنجیدہ اور مضطرب ہیں اور اس حسرت کا اظہار کر رہے ہیں کہ جناب سیدہ کے گھر کو نہ کھلواتے اور خود خلیفہ نہ ہوتے سوچنے کی بات ہے جو اپنی خلافت پر خود راضی نہیں ہے بلکہ خلافت لے کر اللہ کی بارگاہ میں جاتے ہوئے گھبرا رہا ہے تو اس کی خلافت کا ماننے والا کیونکر میدان حشر میں اطمینان حاصل کر سکے گا۔

سوچو اگر انتخاب خلافت اور اعمال خلیفہ مطابق دین ہوتے تو شکر کے کلمات ہوتے نہ کہ حسرت کی باتیں موت کے وقت کی حسرت نے خلیفہ اوّل کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا اسی طرح ماننے والا کل قیامت میں جب حسرت کا اظہار کرے گا کہ کاش میں نے ان کو مانا نہ ہوتا تو وہاں بھی حسرت کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گی کیونکہ حسرت مایوسی کا اعلان ہے نجات کی آواز نہیں لگے ہاتھوں جناب ابوبکر کی سی مستند شخصیت کی زبانی ان تاریخی حقوق کو بھی یاد کریں کہ اگر فاطمہ کے دروازہ پر کوئی پر درد مصیبت نہ آئی ہوتی بلکہ خلافت اور اس کے کارندوں کے ہاتھوں نہ لائی گئی ہوتی تو آج یہ حسرت کیوں ہوتی کیا اس کے بعد بھی در فاطمہ کی توہین کے تاریخی واقعہ کو جھٹلانا ممکن ہوگا۔ اس اقرار کو بھی یاد رکھیں کہ فاطمہؑ کے گھر میں جمع ہونے والے جنگ کرنے والے نہ تھے بلکہ صرف بیٹھ رہنے والے تھے۔ لیکن گوشہ نشینوں کو بھی چھوڑا نہیں جاتا۔ مطالبۂ بیعت کی سختی پر اس اظہار افسوس کے بعد بھی کیا ضرورت ہے یہ ثابت کرنے کی کہ فاطمہؑ کا گھر بیعت پر راضی نہ تھا اب داستان

زیادہ چسپت گواہ ہیں یا نہیں ان کا فرض ہے کہ بعیت کی جھوٹی کہانی دہراتے رہنے کے بجائے مدعی کی سستی بلکہ سچی بات کے اقرار کر لینے کی مذمت میں منہمک ہو جائیں انسان کی تمنائیں آئینہ ہوتی ہیں یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ اپنے اعمال و عقائد پر مطمئن ہے یا مضطرب نفسیات انسانی سے کچھ بھی واقفیت رکھنے والا ہر شخص ذیل کی عبارت میں متعلقہ افراد کی قلبی حالت کو بخوبی دیکھ سکتا ہے تاریخ الخلفاٗ سیوطی مطبوعہ محمدی لاہور کے صے ۹۷ پر درج ہے۔ اخرج البیھقی فی شعب الایمان قال قال ابوبکر واللہ لوددت انی کنت شجرۃ الیٰ جنب لطریق فمر علی بعیر فاخذ نی فادخلنی فلاکتی ثم ازدو رنی ثم اخرجنی بعر اولم اکن بشراً فقال عمر یالیتنی کنت کیش اھلی سمنونی ما بدا لھم حتی اذا کنت کا سمن مایکون زادھم من یحبون فذبحونی لھم فجعلوا البعضی شوا و بعضی قد بدًا ثم اکلونی ولم اکن بشراً۔

بیہقی شعب الایمان میں روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر نے خدا کی قسم کھا کر کہا کاش میں کسی راستہ پر درخت ہوتا جس پر گذرتا ہوا اونٹ منہ مارتا اور مجھے نوچ کر اپنے منہ میں رکھ خوب چباتا پھر نگل جاتا اور مینگنی بنا کر مجھے نکال دیتا یہ سب ہوتا مگر میں کاش انسان نہ ہوتا۔ یہ سن کر حضرت عمر نے فرمایا کاش میں اپنے گھر والوں کا مینڈھا ہوتا جو مجھے ہر ممکن طریقہ پر موٹا کرتے اور جب میں تیاری پر آجاتا تو وہ مجھے اپنے مہمانوں کے لیے ذبح کرتے اور میرے بعض حصّے کے کباب بناتے اور بعض حصوں کا سالن تیار کر کے مجھے کھا جاتے مگر کاش میں انسان نہ ہوتا۔ رومی نے دونوں بزرگوں کی باتیں نقل کی ہیں یہ پڑھنے والے کا کام ہے کہ سوچے اس گفتگو سے پہلے کن باتوں کا ذکر ہوگا مگر دونوں نے اپنی غلطیوں اور ان کے نتائج کا کتنا بھیانک تصور کیا ہوگا جس کے بعد بے قرار ہو کر

تقلید نہیں کی وہ اپنے فرض میں کوتاہ رہا۔

بنابریں جب سے تقلید شروع کرے گا۔ اس کا فرض ہوگا کہ قبل تقلید اعمال کا خود محاسبہ کرے اور جو اعمال اس نے خلاف مسائل فقیہ انجام دیئے ہیں ان کی درستی فقیہ کی ہدایت کے مطابق۔ اعادہ۔ قضا کفارہ وغیرہ کی شکل میں کرے۔ یہ بوجھ اس پر خود اس کی فرض ناشناسی کے ہاتھوں عائد ہوا ہے مذہب عمل کی آسانی دیتا ہے۔ بے عملی کی چھوٹ نہیں دیتا ہے۔

مسائل فہمی کو علمی رخ دیجئے

لال بجھکڑ ہمیشہ سے پائے جاتے تھے - ان کا دوسرا نام ہر دخل بھی ہے- زندگی کے ہر شعبہ میں ان کا وجود عرصہ دراز سے پایا جاتا ہے - کسی کو ہر مرض کی دوا معلوم ہے - کوئی ہر کام کی اپنی ایجاد کردہ دعا بتانے پر تیار رہے مگر ان سب کو لوگ جھڑک دیتے ہیں حقارت سے دیکھتے ہیں - البتہ مذہب کے لال بجھکڑوں اور ہر دخلون کی بڑی آؤ بھگت ہے - اسی آؤ بھگت کو دیکھ کر لوگ ذاکروں- پیشن نمازوں اور علماء پر طنز بھی کرنے لگے ہیں اور علم و عمل کے کورے مذہب کو ذریعہ آمدنی بنانے کی طرف دوڑے چلے آرہے ہیں - چنانچہ کچھ دن پہلے طبیعت قرآن فہموں سے عاجز تھی -

اب مذہبی لال بجھکڑوں کی نئی نسل نکلی ہے - جن کی مسائل فہمی لوگوں کو گمراہ بنانے کا ذریعہ بن گئی ہے - ضرورت ہے کہ علماء سے مسائل سمجھے جائیں اعلم سے پوچھے جائیں اور لال بجھکڑوں کے نکات کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا جائے - یہاں چند مسائل کی تشریح کی جاتی ہے تاکہ گمراہی نہ پیدا ہو بلکہ اہل علم سے مسائل فہمی کی عادت پیدا ہو - میں خود بھی اہلِ علم نہیں ہوں - البتہ اپنی جہالت کو دور کرنے کے لئے کوشاں رہتا ہوں -

شریعت کا متفقہ مسئلہ ہے کہ جب انسان کی جان یا مال یا عزت خطرہ میں پڑ جائے تو حسب ضرورت شریعت کے احکام ملتوی ہو جاتے ہیں - عزت کے

خطرہ میں پڑنے کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ لوگ اس قدر توہین کریں اور مذاق اڑائیں کہ اس مذاق سے پیدا ہونے والی تکلیف کو عقلاء ناقابل برداشت قرار دیں تو ایسی صورت حال میں شریعت کا ہر حکم ملتوی ہو جائے گا۔ آقائے خوئی مدظلہ العالی نے اسی اصول پر توضیح المسائل میں ڈاڑھی کے منڈانے کو اس وقت جائز قرار دیا ہے جب ڈاڑھی عزت کے لئے خطرہ بن جائے اور ناقابل برداشت توہین۔ مذاق اور مسخرہ پن کا سبب بن جائے۔ لیکن شریعت اور مرجع اور فقیہ کا مذاق اڑانے والوں نے اور شریعت کے نام پر ڈاڑھی منڈانے والوں نے اس مسئلہ کے یہ معنی قرار دے لئے ہیں کہ لوگ مذاق اڑاتے ہیں لہذا ہم نے آقائے خوئی کے فتوں کے مطابق ڈاڑھی منڈا دی ہے۔ ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ ڈاڑھی بھی دوسرے احکام شریعت کے التواء کی طرح اسی وقت منڈے گی جب تقیہ کا موقع ہوگا۔ ورنہ نہیں۔

آج دنیا کے سارے شیعہ یا آقائے خوئی کی تقلید میں ہیں یا آقائے خمینی کی تقلید میں ہیں۔ ان دونوں حضرات کے علاوہ بھی آقائے گلپائیگانی۔ آقائے منتظری۔ آقائے مرعشی۔ آقائے شیرازی (مشہد) اور دیگر علماء پائے جاتے ہیں جو کل کے اعلم ہونے والے ہیں۔ کچھ لوگوں کی پریشانی نہیں جاتی کہ ایک وقت میں دو علماء کے اعلم ہونے کا جواز کیا ہوگا۔ ان کو نہیں معلوم کہ اعلم نہ الکشن سے ہوتا ہے نہ سلکشن سے ہوتا ہے نہ تقرر اور انتخاب کا کوئی اور طریقہ ہے۔ کیونکہ انتخاب اور تقرر ہوتا ہی نہیں ہے۔ بلکہ جس طرح سب سے اچھا سرجن سب سے اچھا قانون دان۔ سب سے اچھا انجینیر ماہرین کی رائے سے طے ہوتا ہے اسی طرح اعلم بھی ماہرین علم فقہ کی رائے سے طے ہوتا ہے۔ ماہرین کی رائے کبھی متفقہ ہوتی ہے اور کبھی ایک سے زائد افراد

کے لیئے الگ الگ ماہرین رائے دیتے ہیں۔ لہذا اعلم کے لئے کئی ناموں کا آنا ایک فطری طریقہ کار ہے۔ جس پر کوئی جبر مسلط نہیں کیا گیا ہے۔ عوام کے لئے جس فقیہ کا اعلم ہونا شریعت کے قواعد کے مطابق ثابت ہو جائے یا جس کے لئے گمان ہو جائے اس کے مسائل پر عمل کرنا کافی ہوتا ہے۔ یہ شریعت کی سہولت بھی حاصل ہے۔

طلاق یا وفات کے بعد بیوی یا بیوہ کو عدہ رکھنا ہوتا ہے۔ طلاق کا عدہ اس بیوی کے لئے نہیں ہے جس سے جنسی تعلقات قائم ہی نہیں ہوئے یا جو نابالغ ہے یا جس کے حیض آنے کا سن گذر چکا ہے۔ غیر حاملہ مطلقہ کا عدہ تین حیض ہیں یعنی تیسرا خون دیکھتے ہی عدہ ختم ہو جاتا ہے بشرطیکہ اس کے ایام کی رفتار مستحکم ہو۔ لیکن جس کی رفتار غیر طبعی و غیر مستحکم ہو مثلاً ۳ ماہ میں ایک بار خون آتا ہو تو اس کا عدہ تین مہینہ ہے۔ اور حاملہ مطلقہ کا عدہ وضع حمل ہے۔ ان مسائل کو دیکھ کر آدمی کو خیال ہوتا ہے کہ نسل کے تحفظ کے لئے عدہ رکھا گیا۔ لیکن عدہ وفات غیر حاملہ بیوہ کو بھی بہر حال ۴ ماہ دس دن رکھنا ہوگا چاہے جنسی تعلقات نہ قائم ہوئے ہوں یا بیوہ نابالغہ ہو یا یائسہ ہو یعنی ماہواری کا سن ختم ہو گیا ہو۔ اور حاملہ بیوہ کو وضع حمل اور ۴ ماہ دس دن میں جو مدت زیادہ ہوگی اتنے دن عدہ رکھنا ہوگا۔ اس مسئلہ کو دیکھ کر آدمی سوچتا ہے کہ جب نسل کے مشتبہ ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے تو بھی ۴ ماہ دس دن کا عدہ کیوں رکھا گیا ہے۔ لیکن اگر ان کے پیش نظر یہ بات ہوتی کہ شوہر کے مرنے پر شریعت نے بیوہ کیلئے سوگ واجب کیا ہے کہ وہ عدہ کے زمانہ میں زینت کا سامان نہ استعمال کرے تو ان پر یہ بات واضح ہو جاتی کہ عدہ جہاں حفاظت نسل کے لئے ہے وہاں زندگی کی شرافت کو باقی رکھنے کیلئے سوگ کے طور پر بھی ہے۔ اسی طرح اگر الجھے مسائل سلجھائے جائیں علم اور اطمینان میں اضافہ ہوگا۔

عبادت کرو
عبادت کو عادت نہ بناؤ

سستی چیز خریدنا ہر شخص کو پسند ہے۔ مگر اکثر سستی کے چکر میں نقصان ہوتا ہے۔ اسی لئے کہاوت ہے کہ مہنگا روئے ایک بار اور سستا روئے بار بار۔ عورتوں کو سستی چیز خریدنے کا شوق کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ چونکہ عورتوں کا عام مزاج شکی ہوتا ہے لہذا ہر قیمت کو وہ زیادہ سمجھتی ہیں اور ہر مال کو وہ وزن سے کم سمجھتی ہیں۔ لانے والا ان دونوں باتوں میں ان کی نظر میں مشکوک رہتا ہے کہ کم دام میں لایا ہے اور زیادہ پیسے بتاتا ہے یا کم لایا ہے اور باقی مال کے پیسے بچالئے ہیں۔ شک بھی کم زیادہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اس مزاج کی عورتیں بھی الگ الگ ہوتی ہیں کچھ کو لانے والے ملتے ہی نہیں کہ کون لائے کہ لائے بھی اور بے ایمان بنے۔ اگر یہ عورتیں یاد رکھیں کہ اکثر بدگمانیاں حرام ہوتی ہیں اور بدگمانی کرنے والا سخت گناہگار ہوتا ہے تو سماج کا سدھار ممکن ہے قرآن مجید اُسی کے لئے شفا ہے جو اس کے احکام پر عمل کرے۔ اسے پڑھے۔ سمجھے اور سمجھنے میں اہلبیت علیہم السلام کی حدیثوں سے مدد لے اس کی بیماری کبھی دور نہیں ہو سکتی جو دوا سے دور بھاگے اور بیماری کو خوبی سمجھ کر عادت بنائے۔ شکی مزاج عورتیں اپنے شوہر اور بیٹے وغیرہ کو پھوہڑ سمجھتی ہیں۔ چونکہ ان کے بارے میں بے ایمانی کا خطرہ نہیں ہے

کہ دام زیادہ بتائیں گے یا مال کم لائیں گے۔ لہٰذا شک یہ راستہ نکالتا ہے کہ مال پہچاننا اور قیمت چکانا ان کو نہیں آتا ہے لہٰذا خرید و فروخت میں پھوہڑ ہیں لیکن ان عورتوں کو سوچنا پڑے گا سب سے پہلے انھوں نے پھوہڑپن کیا۔ جو پھوہڑ کو شوہر بنایا اور بیٹے کو اپنی پرورش کے ذریعہ پھوہڑ بنایا۔ پھر دوسرا پھوہڑپن یہ ہے کہ جو ہے اس پر صبر کرنے کے بجائے پھوہڑپن کو محلے اور عزیزوں میں بانٹ کر اپنے گھر کی عزت کو کم کر رہی ہیں جو سب سے بڑا پھوہڑپن ہے۔ اس بیماری کا سبب اپنی عقل کو زیادہ سمجھنا ہے۔ جبکہ یہ سب سے بڑی بے عقلی ہے کہ ہم اپنی عقل کو بھی نہ جان سکیں کہ کتنی ہے۔ سکون سے وہ شخص رہتا ہے جو دوسروں کو جاننے کے پہلے اپنے بارے میں واقفیت حاصل کرتا ہے۔ اور ہمیشہ اپنی حقیقت کو یاد رکھتا ہے۔ ایسا انسان کا پارہ نہ چڑھتا ہے نہ اترتا ہے بلکہ سیلاب وطوفان اور خشکی اور سوکھے روکھے پن کے بجائے اپنی مناسب رفتار پر اس کی زندگی بہتی رہتی ہے۔ گلیوں میں گھوم کر گھروں پر مال بیچنے والوں کو عورتوں ہی سے سابقہ پڑتا ہے لہٰذا وہ پہلے ہی سے ایک کے اکیاون بتاتے ہیں اور اکیاون کو گھٹاتے گھٹاتے بھی عورتیں ایک سے زیادہ پر مال خرید لیتی ہیں عورتیں خوش کہ ہم نے اکیاون میں ۴۹ گھٹا لئے۔ اور مال بیچنے والا خوش کہ ہم نے دونے دام پر مال بیچ لیا۔ ایک روپیہ مال کا ایک روپیہ سستا خریدنے کے شوق کا اور شکی مزاج کا عورتوں کو دینا پڑتا ہے۔

مرد بھی عورتوں سے کم نہیں ہوتے ہیں۔ سستا خریدنے والے ترکاری منڈی میں شام کو بلکہ رات کو جاتے ہیں کہ سستا مال خرید لائیں۔ منڈی میں دو طرح کے دوکاندار ملتے ہیں۔ ایک وہ جن کی مستقل دوکان منڈی

میں ہے مگر وہ بھی اپنا مال منڈی میں دوسروں کے ساتھ لگاتے ہیں تاکہ ایک دوکان کی دو دوکانیں ہوجائیں اور جو جہاں پھنس جائے اچھا ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہوتے ہیں جو ترکاری سبزی اپنے کھیت۔ باغ سے لاتے ہیں اور سرشام یا رات گئے تک واپس ہوجانا چاہتے ہیں۔ ان کے مال کے پہلے خریدار منڈی کے مستقل دوکاندار ہوتے ہیں جن کے بہت سے ایجنٹ دام لگاتے اور نیلام میں حصہ لیتے پھرتے ہیں۔ یہ لوگ سب سے اچھا مال سب سے کم دام پر خرید کر اطمینان سے مہنگے داموں پر بیچتے رہتے ہیں۔ البتہ شام کو کچھ لوگ اپنا مال بیچ کر دوکان بڑھانے کی فکر میں ہوتے ہیں۔ ان میں بیچنے والوں کی ناک میں سستا مال خریدنے والے سرشام یا بعد مغرب آتے ہیں۔ اور بغیر وزن کے ڈھیریوں کی شکل میں رکھا مال خریدتے ہیں اپنے خیال میں کم دام پر ڈھیروں مال خرید لیتے ہیں مگر گھر جاکر معلوم ہوتا ہے تعداد تو بہت ہے مگر زیادہ تر سڑا ہے۔ سوکھا ہے۔ بیکار ہے۔ مال جتنا مقدار میں زیادہ ہے۔ مال کا معیار اتنا ہی کم ہے یہ لوگ مقدار اور کوانٹیٹی کے حریص اور عاشق ہوتے ہیں۔ خوبی اور معیار۔ اچھائی اور کوالیٹی سے بے خبر ہوتے ہیں۔ خوش خوش بغیر مزدور کے ہانپتے کانپتے سڑا سوکھا مال منڈی سے لاد کر گھر لاتے ہیں پھر تعریف طلب نظروں سے گھر والوں کو دیکھتے ہیں مگر بیٹی۔ بیوی۔ خادمہ کی آوازیں بلند ہوتی ہیں ساگ سڑا ہے۔ شلجم جڑیلے ہیں۔ ٹماٹر پھینک دینے کے قابل ہیں۔ مولی کے لئے منہ کے بجائے چبانے والی مشین درکار ہے۔ ترئی میں جالے پڑے ہیں۔ لوکی سخت ہے۔ گل نہیں سکتی۔ پیسے گئے۔ پسینہ خشک نہیں ہوا اور تعریف کے بجائے صلواتیں سننے کو مل رہی ہیں۔ مگر یہ جھوٹی تسلی میں لگ جاتے ہیں روپیہ کلو شلجم ہے ایک روپیہ میں کلو لایا ہوں۔ خراب نکال کر بھی

۲ کلو تو اچھا نکلے گا مگر وہ شلجم ایسے جم گئے ہیں کہ بکری نے بھی سونگھ کر منہ ہٹالیا ہے۔ اب عورتیں لڑکوں کی خوشامد کر رہی ہیں کہ سڑی ترکاری باہر پھیک آؤ۔ وہ سنتے نہیں۔ پھر بہت کہنے سننے پر راضی ہوئے تو قریب ہی کسی کے گھر کے سامنے پھینک آئے۔ صبح پڑوسی نے گالیاں پھینکنا شروع کی۔ رات کو جائیں گے سڑی ترکاری خرید لائیں گے ہمارا دروازہ اور گلی سڑائیں گے۔ مگر اپنی سڑی عقل نہ بدلیں گے۔ اس پوری کہانی اور داستان کا ماحصل ہے کہ حریص انسان مقدار اور کونٹیٹی کے عاشق ہوتے ہیں۔ خوبی۔ معیار اور کوالیٹی پر نظر نہیں رکھتے ہیں۔

رمضان کے مہینے میں ثواب کے حریص بھی یہی غلطی کرتے ہیں کہ عبادت کی مقدار بڑھاتے ہیں۔ عمدہ کوالیٹی کی عبادت کرنے کا شوق نہیں رکھتے ہیں۔ بیشک انسان میں خدا نے لالچ اسی لئے پیدا کی ہے کہ دنیا کے بجائے آخرت کی لالچ کی جائے۔ ہدایت کی لالچ کی جائے۔ دین اور علم دین و پابندی دین و تعلیم دین کی لالچ کی جائے۔ یہی لالچ اس قدر ممدوح ہے کہ حضور کو خداوند عالم نے امت کی ہدایت کا حریص لے کر حضورؐ کی تعریف کی ہے۔

مگر برا ہو شیطان کا وہ آخرت کی لالچ میں بھی گھس پڑتا ہے۔ اور عبادت کی تعداد بڑھانے کا شوق دلا کر عبادت کے معیار کو کم کرتے کرتے اتنا کم کر دیتا ہے کہ عبادت عبادت نہیں رہ جاتی ہے۔ عبادت صرف حکم خدا کی تعمیل کا نام ہے۔ اگر روزہ بچہ کی پرورش میں رکاوٹ بنے دودھ کم ہو جائے۔ بچہ بھوکا رہ جائے تو روزہ حرام ہو گا یعنی اب روزہ نہ رکھنا عبادت ہو گا۔ شیطان سمجھاتا ہے خدا کے لئے بچہ کو بھوکا رکھنے میں ثواب اور بڑھ جائے گا اور ماں شیطان کے چکر میں پڑ کر خود روزہ رکھتی ہے جو فاقہ ہے۔

گناہ ہے عبادت نہیں ہے اور ماں کی ممتا کو تقدس کے دھوکے میں لاکر بچہ کو بھوکا رکھتی ہے اور بھوکے بچہ کو دیکھ کر خوش ہوتی کہ میں نے کتنی بڑی قربانی خدا کے لئے دی ہے یہ قربانی نہیں ہے بلکہ نافرمانی ہے۔ لیکن ہماری عادت ہے کہ ہم جسے اچھا سمجھ لیں وہی کریں گے حالانکہ عادت عبادت نہیں ہے۔ اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ ماں نے صبح پانچ پارے کی تلاوت کی عادت ماہ مبارک میں شروع کی ہے۔ بچہ رو رہا ہے۔ گندگی میں پڑا ہے۔ اور ماں تلاوت میں لگی ہے۔ جلدی جلدی تلاوت کر رہی ہے۔ حرف کٹ رہے ہیں۔ زیر زبر غلط ہو رہے ہیں۔ وقف و وصل کے نشانات کے اوپر سے تلاوت چھلانگ لگا رہی ہے کہ کسی طرح پانچ پارے ہو جائیں۔ کبھی بچہ کو تھپکتی ہے۔ کبھی اس کے بڑے بھائی بہن کو کڑی 'ہوں' کے ذریعہ تلاوت کے درمیان ڈپٹتی ہے کہ بچہ کو چپ کرالو۔ تلاوت کی عادت جب پوری ہو جاتی ہے تو پہلے بچہ پر غصہ کرتی ہے کہ تلاوت کے وقت شیطان بن جاتا ہے حالانکہ وہ اس وقت نہ صرف معصوم بچہ تھا بلکہ مظلوم بھی تھا۔ جس پر تقدس اور عبادت کے نام ظلم ہو رہا تھا۔ حالانکہ وہ عادت تھی عبادت نہ تھی۔ اسی طرح گھر میں پکنے کا سامان نہیں ہے۔ شام ہو رہی ہے روزہ دار عورتیں نڈھال ہیں۔ دن ڈھل کر ختم ہونے والا ہے مگر سامان لانے والے گھر کے مرد کے ابھی روزمرہ کے مقررہ پارے نہیں پورے ہوئے ہیں۔ عورتوں کے کانوں میں اس تلاوت کی آواز آرہی ہے جو تلاوت کم ہے بلکہ پارے جلدی جلدی اُوٹے جا رہے ہیں اور مرد کے کان میں عورتوں کے طعنے اور فقرے آرہے ہیں۔ صبح دوستوں میں رہیں گے۔ روزہ گپ بازی میں بسر کریں۔ شام کو ہم کو ستانے کے لئے قرآن پڑھنے بیٹھ رہے گر خدا خدا کر کے تلاوت ختم ہوئی۔ اور تلاوت ختم ہوتے ہی

بنام خدا ایک زبردست جھگڑا ہوا شیطان کی بن آئی زندگی بندگی دونوں کی کرکری ہوگئی جب کچھ جھگڑا اتھما تو تھیلا لے کر سامان لانے گئے باقی لڑائی دوکانداروں سے لڑے۔ گھر میں سامان لاکر پٹکا۔ تھکی عورتوں نے کام شروع کیا۔ یہ کچھ تلاوت ——— کچھ غم و غصہ۔ کچھ افطاری کی تاخیر کے باعث نڈھال تھے۔ جبکہ تاخیر کا سبب بھی خود ہی تھے۔ گھر میں روزہ کھولنے کا ماحول نہیں تھا کیونکہ بدمزاجی نے سب کی زبانیں کھول دیں تھیں۔ سوچا ایسے میں مسجد بہتر ہے۔ مگر وہاں بھی پہلے سے ان کے ایسے بہت سے دفتر۔ گھر۔ بازار سے بگڑے دل جمع ہو چکے تھے۔ نمازی کم تھے۔ بگڑے زیادہ تھے لہٰذا برتن ٹکرا گئے شور میں نماز دب گئی۔ گالی آمیز جھگڑے جماعت پر چھا گئے پیشنمازصاحب نے سنتی نماز میں پناہ لینا بہتر خیال کیا۔ اور وہ بھی کچھ خفا خفا نماز پڑھ رہے تھے کیونکہ ان کی افطاری بھی آج لیٹ تھی اور آئی بھی تو عادت کے مطابق نہ تھی بلکہ عبادت کے مطابق سادی سادی سی تھی۔ مومن کی افطاری اگر پیش نماز کو دیدی جائے تو بھلا عادت پر بار کیوں نہ ہوگا۔ اور اگر افطاری میں مومن اور پیش نماز میں فرق نہ ہوسکا تو پھر ایسی سادی پیش نمازی سے فائدہ؟ ان تمام برائیوں کے علاج کے لئے ضرورت ہے کہ عبادت میں بھی کسی چیز کو عادت نہ بننے دیا جائے ورنہ آدمی عادت کو پورا کرنے کے چکر میں اپنے کو بھی دوسروں کو بھی کھو دے گا۔ اور جب خیال عادت کو پورا کرنے کا رہے گا تو قربتہً الی اللہ کی نیت مٹ جائے گی اور عبادت عادت رہ جائے گی عبادت نہیں رہے گی یہی حال ان لوگوں کا بھی ہوتا ہے جو نمازوں کے بعد دل لگے یا نہ لگے۔ ضروری کاموں میں چاہے خرابی آجائے مگر وہ مقررہ وظیفہ اُدھ پڑھے بغیر مصلے نہیں چھوڑیں گے۔ اور اگر مجبوراً چھوڑ دیں گے تو دن بھر ان کے دل کو

شک گھیرے رہے گا کہ وظیفہ نہیں پورا ہوا کہیں آج کوئی نقصان نہ ہو جائے۔ کوئی کام نہ بگڑ جائے۔ کوئی بلا نہ آجائے حالانکہ اول تو دنیا عمل کی جگہ ہے جزا اور سزا کی جگہ نہیں ہے۔ پھر رحیم و کریم خدا بندوں سے زیادہ اپنے بندے کی مجبوری کو جانتا ہے اور نظر کرم کرتا ہے۔ جب بندے مجبوری کے ایسے موقع پر رحم کرتے ہیں تو مالک کرم کیوں نہ کرے گا۔ تصور بلاء نقصان بھی وسوسہ شیطانی اور ابلیسی اور اندیشہ غیر اسلامی ہے۔

حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے اسی لئے فرمایا ہے کہ عبادت کرو یعنی ہر کام صرف حکم خدا کے مطابق کرو اور صرف اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کرو۔ عبادت کو عادت نہ بناؤ ورنہ اپنی تسکین کے لئے جو کام کروگے وہ قربتہ الی اللہ نہ ہوگا لہٰذا یاد رکھو عادت عبادت نہیں ہے۔

اس لئے عبادت کرو۔ عبادت کو عادت نہ بناؤ۔

تعلیم اور ملازمت

ڈارون بندر سے آدمی نہ پیدا کر سکا۔ البتہ غلط وا حمقانہ نظریات پیش کرنے والے فلسفیوں کی صف اول میں جا کھڑا ہوا۔ لیکن خدائے قادر نے آدمیوں کو جناب آدمؑ سے اور آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا۔ اور اس مٹی سے انسان کے علاوہ جانور بھی پیدا کئے۔ دونوں کو الگ صنف قرار دیا۔ لیکن مٹی نے اپنا زور دِکھایا انسانوں میں جانوروں کے اوصاف کی جھلک آگئی اور جانوروں میں انسانی خصائل کا جلوہ دکھائی دینے لگا جہاں جانوروں میں انسانی ذہانت کے نشانات ملتے ہیں وہاں انسانوں میں جانوروں کی بے عقلی کے مقامات بھی ملتے ہیں۔ بے وقوفی۔ حماقت، بے حسی۔ یہ تین جانور بلند رتبہ کے مالک ہیں جن کو لوگ گدھا۔ بھیڑ اور بھینس کہتے ہیں۔ گدھا ضرب المثل ہے۔ بھیڑ نامور ہے بھینس اپنا جواب آپ ہے۔ انسانوں میں بھی ان جانوروں کے نمائندے پائے جاتے ہیں۔ جیٹھ بیساکھ میں موٹا ہونا اور ساون بھادوں میں دبلا ہونا گدھے کے لئے مشہور ہے لیکن انسانوں میں بھی ایسے نہیں جن کو روزی کے لئے کام کرنا پڑتا ہے تو اپنے کو دکھی محسوس کرتے ہیں اور جب بیکاری میں فاقے کرتے ہیں تو چارپائی کے بان توڑ کر اپنے کو سکھی محسوس کرتے ہیں اگر بھینس کسی کو کچل دے اور کسی سے اس کا جسم چھل جائے ان فکروں

سے بے نیاز ہو کر چلتی رہتی ہے اور کسی کی تنقید کا کوئی اثر نہیں لیتی ہے تو انسانوں میں بھی کچھ ایسے ہیں جو دولت - لالچ - ترقی - فیشن - شہرت وغیرہ کے نشے میں دہشت سماج میں دوسروں کو کچلتے ہوئے اور اپنی روح و اخلاق و سکون کو زخمی کرتے ہوئے زندگی کا سفر طے کر رہے ہیں -

اگر گدھے اور بھینس کے خصائل والے انسان پائے جاتے ہیں تو بھیڑ بے چاری کیوں محروم رہ جاتی انسانوں نے اپنے میں اس کے نمائندے بھی پیدا کر لئے - بھیڑ کا قومی خاصہ یہ ہے کہ اگلی بھیڑ کے پیچھے ہر بھیڑ چلے گی چاہے سب کنویں میں گر جائیں بلکہ کچھ کے گر جانے کے بعد باقی بھیڑوں میں جلد گرنے اور کنویں کی مہلک گہرائی تک پہنچنے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے -

ہم انسانوں میں بھی اکثر کا حال یہی ہے - ہم زندگی میں راہ اور روش اپنے ذہن سے طے نہیں کرتے بلکہ سماج کی اگلی بھیڑوں کی تقلید کرتے ہیں - اسی تقلید کا نام فیشن ہے - اسی تقلید کا نام رسم و رواج ہے - اسی تقلید کا نام ترقی پسندی ہے -

لڑکیوں کی تعلیم - مشترک تعلیم - نامحرموں کے مشترک اور بے تکلف اجتماعات - مذہب - اخلاق اور روحانیت سے متصادم روش کو جان دینے کی حد تک اپنانے کی کوشش کرنا سب اسی نابینا تقلید کا نتیجہ ہیں - جو رائج ہو جاتے ہیں اس کا بجا لانا واجب ہے - رائج کے خلاف سوچنا حرام ہے - اس کے خلاف آواز اٹھانا قابل گردن زدنی جرم ہے - لیکن گردن کٹا کر بھی بات کہی گئی ہے - زبانیں کٹ گئی ہیں مگر بے زبانی ترجمان بن گئی ہے - ہر عہد میں رائج روش کے خلاف سوچنے والے - بولنے والے - لکھنے والے پیدا ہوتے ہیں جن کی بات رفتہ رفتہ سنی گئی ہے اور آخر الامر

رواج بدلے ہیں۔

اس مضمون میں خاص طور پر اس امر کی طرف توجہ دلانا ہے کہ جنوبی ہند میں کم اور شمالی ہند میں زیادہ تر ایسے شیعہ خاندان پائے جاتے ہیں جو صرف ملازمت کے لئے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ تعلیم بہر حال ضروری ہے اور دنیاوی تعلیم سے زیادہ دینی تعلیم ضروری ہے۔ نہ اسے چھوڑنا ہے نہ اسے ترک کرنا ہے لیکن دینی تعلیم حصول آخرت کے لئے ہونا چاہیئے نہ کہ حصول معاش کے لئے۔ دنیاوی تعلیم کا مقصد صرف حصول معاش نہیں ہونا چاہیئے بلکہ بہتر معاش و معاشرت کا حصول اس تعلیم کا مقصد ہونا چاہئے۔ لیکن ذریعہ معاش کو ملازمت قرار دینا قومی خودکشی ہے۔ روزی کے دروازے کو تقریبا بند کرنا ہے۔

ہمارے رہبروں نے ہم کو اطلاع دی ہے کہ روزی کے دس حصے ہیں ۹ حصے تجارت میں ہیں۔ ایک حصّہ میں دوسرے تمام روزی حاصل کرنے کے ذرائع شامل ہیں اور ان ذریعوں میں سب سے بدتر کمتر و مختصر ذریعہ ملازمت ہے۔

ملازمت میں خدا صرف اس وقت یاد آتا ہے جب ہم معطل ہو جاتے ہیں ورنہ زمانہ ملازمت میں خدا معطل رہتا ہے ملازمت کے باعث اولادیں ملازمت پر رہتی ہیں بوڑھے والدین وطن میں لاوارثوں کی طرح رہتے ہیں۔ ملازمت کے بعد تجسس۔ حرام سے بچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ واجبات کی ادائگی دینی پابندی مفقود ہو جاتی ہے۔ ملازمت کی خرابیوں کے اس رُخ کے علاوہ دوسرا رخ یہ ہے کہ کوئی شخص تنخواہ پر اکتفا کر کے نہ اپنی ضرورتیں پوری کر سکتا ہے نہ چین سے اولاد کو پال سکتا ہے نہ پڑھا سکتا ہے نہ

بیاہ سکتا ہے۔ فکرمندی۔ قرض۔ رسوائی ملازمت کے خاصے ہیں۔

لہٰذا معاشرہ کو بدلئے۔ ذہن بدلئے۔ ملازمت کے بجائے تجارت زراعت، صنعت وحرفت وغیرہ کو ذریعہ معاش قرار دیجئے۔ ملازمت کی تمکنت پر فریفتہ نہ ہو جائیے تجارت کو ذلیل پیشہ نہ سمجھئے میاں ہونے پر فخر نہ کیجئے۔ بنیوٹ نام رکھ کر تجارت کی تحقیر نہ کیجئے۔ مزدوری کیجئے مگر ملازمت نہ کیجئے۔ مزدور آزاد ہے۔ ملازم غلام ہے۔ مزدوری۔ باغبانی کاشتکاری تجارت ہمارے نبی وائمہ علیہم السلام نے کی ہے مگر انھوں نے کبھی ملازمت نہیں کی ہے۔ ملازمت کے بیشمار نقصانوں میں سے ایک نقصان یہ ہے کہ لڑکا جب پڑھ لکھ کر نوکر ہو جائے۔ گھر سنبھال لے تو اس کی شادی ہو لہٰذا ۲۵ اور ۳۰ سال کی عمر سے پہلے شادی نہیں ہو سکتی۔ لازمی نتیجہ ہو گا کہ لڑکیاں بھی اسی عمر تک بیٹھی رہیں گی۔ ملازمت سے پیٹ نہیں بھرے گا لہٰذا جہیز سے گھر بھرنے کا بے رحم اور تباہ کن رواج باقی رہے گا لڑکیاں مستقبل سے مایوس رہیں گی ان کے والدین فکرمند رہیں گے۔ لڑکے لالچ میں شرافت وانسانیت کھوتے رہیں گے۔ لڑکے کے والدین بے رحم سود خوروں سے زیادہ جلاد بن کر مطالبے کریں گے۔ نسبتیں طے ہونے کے بعد توڑتے رہیں گے۔

اس کے برخلاف تعلیم کو زندگی کا زیور بنائیے۔ دین کو زندگی کا رہبر بنائیے۔ رازق سے مانگئے اور بندوں کی غلامی چھوڑ کر تجارت کیجئے اولاد کے ذہنوں کا رخ بدلئے خوش حال رہئے۔ دیندار رہئے۔ دنیا کمائیے اور آخرت ہاتھ سے نہ جانے دیجئے۔

شام زندگی کے اندھیرے اجالے

انسان جن عقائد و اعمال کا اظہار کرتا ہے اور ان کی تبلیغ کر کے دوسروں کو اس راستہ پر چلاتا ہے خود بھی ان عقائد و اعمال کو واقعاً صحیح سمجھتا ہے یا نہیں مذہب و اخلاقیات کی تاریخ میں یہ نہایت دلچسپ سوال ہے بلکہ اتنا اہم سوال ہے جس کے معلوم ہو جانے پر انسان اپنے قدیم مذہب پر باقی رہنے یا اس کے بدلنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

اگر عقائد و نظریات سچے ہیں تو ان کا پیش کرنے والا ان پر عقیدہ بھی رکھے گا اور موت و زیست کی کشمکش کے وقت بھی نہ صرف ان پر باقی رہے گا بلکہ کشمکش کے موقع پر اپنے لئے ان کو باعث تقویت و تسکین قرار دے گا برخلاف اس کے اگر عقائد غلط اور خود غرضیوں کو حاصل کرنے کے لیے دوسروں کو آلۂ کار بنانے کے لئے پیش کئے گئے ہیں تو پیش کرنے والا ان پر یقین نہیں رکھے گا اور مصیبت و موت کے موقع پر اطمینان کے بجائے مضطرب ہو کر اس حقیقت کا اظہار کرے گا کہ دوسروں کو جو سمجھایا تھا خود اسے غلط سمجھتا ہے۔ زیر نظر مضمون میں آپ کے سامنے دونوں طرح کی مثالیں پیش کی جائیں گی جن سے آپ بہ آسانی فیصلہ کر سکیں گے کہ زندگی کا سورج جب ڈوبنے لگتا ہے تو کون اندھیرا محسوس کرتا ہے اور کون اجالا، جس کی زندگی کی شام میں اندھیرا دیکھو سمجھ لو کہ اس کا راستہ غلط ہے اور جس کی شمع حیات کے گل ہونے پر بھی اجالا نظر آئے اس کے

راستے کو صحیح سمجھو۔ یہ اصول صرف اصول ہی نہیں بلکہ تاریخ میں اسے پرکھا جا چکا ہے اور اسی معیار پر عظیم فیصلے کئے جا چکے ہیں۔ مباہلہ میں آنحضرتؐ کی فتح اور نصاریٰ کی شکست اسی اصول کے ماتحت ہوئی تھی ورنہ مقابلہ تو ہوا ہی نہ تھا کیونکہ نصاریٰ نے طے کیا تھا کہ اگر اسلام سچا مذہب نہیں بلکہ اقتدار کا ڈھونگ ہے تو نبیؐ مباہلہ کے میدان میں ہلاکت کے خیال سے خوفزدہ ہوں گے اور فطری تقاضے کے ماتحت اپنوں کو بچا کر غیروں کو اپنے سیاسی اغراض پر بھینٹ کریں گے برخلاف اس کے اگر اسلام واقعی سچا مذہب ہے تو نبیؐ بے خوف ہوں گے لہٰذا غیروں کو لانے کے بجائے اپنوں کو لائیں گے۔ جب مباہلہ میں کوئی "غیر" حاضر نہ تھا اور نبیؐ کا کوئی "اپنا" غیر حاضر نہ تھا تو نصاریٰ کو یقین کرنا پڑا کہ اسلام سچا مذہب اور بانیٔ اسلام کو خود اپنے مذہب پر اعتماد کامل ہے۔ یہ ایسی خود اعتمادی تھی جس نے نصاریٰ کے اعتماد مذہبی کو منہدم کر دیا نہ صرف منہدم کر دیا بلکہ مجبور کر دیا کہ یا تو حق کا اقرار کیا جائے یا جزیہ کی عریاں شکست کو تسلیم کر لیا جائے نصاریٰ نے اپنے سیاسی مقاصد کے لیے دوسری راہ اختیار کی اور نبیؐ نے اس کو قبول کر لیا کیونکہ ہادی کا کام باطل کو عریاں اور حق کو روشن کرنا ہے جو حاصل ہو چکا تھا رہا کلمۂ حق پڑھنے پر مجبور کرنا نبیؐ نے اس پر اصرار نہ کیا کہ مباہلہ کرو یا مسلمان ہو جاؤ کیونکہ مجبور کرنا نہ دین میں جائز ہے نہ جبر دین بن سکتا ہے۔

مذہب پر خود مذہب کے میر کارواں کو یقین ہے یا نہیں اسی اصول کو عملی طور پر پیش کرنے کے لئے جناب ابراہیمؑ سے قربانی کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور خلیل مطالبۂ محبوب کو پورا بھی کر دیتے ہیں، بلکہ مطالبہ بھی صرف خواب میں ہوا تھا مگر خلیل نے خواب کو صرف ایک خیال نہیں قرار دیا بلکہ حقیقت بنا دیا۔ خدا کبھی اپنے لئے انسانی گلے کو کتنا منظور نہیں کرتا ...

کام تھا اور فدیہ بھیجنا خدا کا فرض تھا۔

اس واقعہ کے بعد یہ تو ممکن ہے کہ کوئی خدا کے وجود کا اقرار نہ کرے گا مگر جناب ابراہیمؑ خدا کو نہیں مانتے تھے یہ کہنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔

مسلمانوں میں آنحضرتؐ کی شخصیت پر اتحاد نظر کے بعد جو مذہبی اختلافات پائے جاتے ہیں اور جن کو فرقہ کی شکل میں شیعہ اور سنی میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور کوئی مسلمان چاہتا ہے کہ ان اختلافات میں حق و باطل کو پہچان لے تو اس کے لئے بھی یہی راستہ ہے کہ وہ دیکھے سنی عقیدہ جن شخصیتوں سے وابستہ ہے وہ شخصیتیں موت کے وقت اپنے کو اندھیرے میں گھرا پاتی ہیں یا اجالے میں دیکھتی ہیں اور شیعہ عقیدہ جن شخصیتوں سے لپٹا ہوا ہے وہ حضرات موت کے وقت تاریکی میں ہیں یا روشنی میں۔ موت حقیقت بھی اور حقیقت کی طرف راہ نما بھی ہے۔ جب آخرت کا سفر شروع ہو تو دیکھو کون کس حال میں آغاز سفر کر رہا ہے اور اسی حالت کو دیکھ کر طے کرو ہم کو کس کا راستہ اختیار کرنا چاہئے اب آپ کے سامنے صرف حضرات اہلسنت کی کتابوں سے ان کا ذکر پیش کیا جاتا ہے جن کی شام زندگی میں اندھیرے ہیں۔

طبری جلد ۴ ص ۵۲ حالات ۱۳ھ میں درج ہے" ان ابا بکر الصدیق قال فی مرض موته وددت انی لم اکشف بیت فاطمه عن شیئ وان کانوا قد خلقوه علی الحرب وددت انی یوم سقیفه کنت قذفت مالامی فی عنق احد الرجلین یرید عمر وا با عبیدة

(ترجمہ) ابوبکر صدیق وفت کہتے تھے کاش میں نے فاطمہ کے دروازے کو نہ توڑا ہوتا چاہے ان لوگوں نے مجھ سے جنگ کرنے کے خیال ہی سے کیوں نہ دروازہ بند کیا ہوتا ...... کاش سقیفہ کے دن (جس دن ابوبکر خلیفہ بنائے

گئے تھے) میں نے خود خلافت قبول کرنے کے بجائے عمر یا ابو عبیدہ کسی ایک کی

گردن پر یہ جوا رکھ دیا ہوتا۔

وقت موت خلیفۂ اوّل مسرور و مطمئن نہیں ہیں کہ انھوں نے زندگی صحیح

مقاصد اور صحیح طرز عمل پر گذاری بلکہ رنجیدہ اور مضطرب ہیں اور اس حسرت

کا اظہار کر رہے ہیں کہ جناب سیدہ کے گھر کو نہ کھلواتے اور خود خلیفہ نہ ہوتے

سوچنے کی بات ہے جو اپنی خلافت پر خود راضی نہیں ہے بلکہ خلافت لے کر اللہ

کی بارگاہ میں جاتے ہوئے گھبرا رہا ہے تو اس کی خلافت کا ماننے والا کیونکر

میدان حشر میں اطمینان حاصل کر سکے گا۔

سوچو اگر انتخاب خلافت اور اعمال خلیفہ مطابق دین ہوتے تو شکر کے

کلمات ہوتے نہ کہ حسرت کی باتیں موت کے وقت کی حسرت نے خلیفہ اوّل کو

کوئی فائدہ نہیں پہنچایا اسی طرح ماننے والا کل قیامت میں جب حسرت کا اظہار

کرے گا کہ کاش میں نے ان کو مانا نہ ہوتا تو وہاں بھی حسرت کوئی فائدہ نہیں

پہنچائے گی کیونکہ حسرت مایوسی کا اعلان ہے نجات کی آواز نہیں لگے ہاتھوں

جناب ابوبکر کی سی مستند شخصیت کی زبانی ان تاریخی حقوق کو بھی یاد کرلیں کہ

اگر فاطمہ کے دروازہ پر کوئی پر درد مصیبت نہ آئی ہوتی بلکہ خلافت اور اس کے

کارندوں کے ہاتھوں نہ لائی گئی ہوتی تو آج یہ حسرت کیوں ہوتی کیا اس کے

بعد بھی در فاطمہ کی توہین کے تاریخی واقعہ کو جھٹلانا ممکن ہو گا۔ اس اقرار کو بھی

یاد رکھیں کہ فاطمہؑ کے گھر میں جمع ہونے والے جنگ کرنے والے نہ تھے بلکہ صرف

بیٹھ رہنے والے تھے۔ لیکن گوشہ نشینوں کو بھی چھوڑا نہیں جاتا۔ مطالبۂ بیعت

کی سختی پر اس اظہار افسوس کے بعد بھی کیا ضرورت ہے یہ ثابت کرنے کی کہ

زیادہ چسپت گواہ ہیں یا نہیں ان کا فرض ہے کہ بعیت کی جھوٹی کہانی دہراتے رہنے کے بجائے مدعی کی سستی بلکہ سچی بات کے اقرار کر لینے کی مذمت میں منہمک ہو جائیں انسان کی تمنائیں آئینہ ہوتی ہیں یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ اپنے اعمال و عقائد پر مطمئن ہے یا مضطرب نفسیات انسانی سے کچھ بھی واقفیت رکھنے والا ہر شخص ذیل کی عبارت میں متعلقہ افراد کی قلبی حالت کو بخوبی دیکھ سکتا ہے تاریخ الخلفاء سیوطی مطبوعہ محمدی لاہور کے صـ۹۷ پر درج ہے۔ اخرج البیھقی فی شعب الایمان قال قال ابو بکر واللہ لوددت انی کنت شجرۃ الیٰ جنب لطریق فمر علی بعیر فاخذ نی فادخلنی فلاکتی ثم ازدورنی ثم اخرجنی بعر اولم اکن بشراً فقال عمر یالیتنی کنت کیش اھلی سمنونی ما بدا لھم حتی اذا کنت کاسمن مایکون زادھم من یحیون فذبحونی لھم فجعلوا البعضی شوا و بعضی قدیداً ثم اکلونی ولم اکن بشراً۔

بیہقی شعب الایمان میں روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر نے خدا کی قسم کھا کر کہا کاش میں کسی راستہ پر درخت ہوتا جس پر گذرتا ہوا اونٹ منہ مارتا اور مجھے نوچ کر اپنے منہ میں رکھ خوب چباتا پھر نگل جاتا اور مینگنی بنا کر مجھے نکال دیتا یہ سب ہوتا مگر میں کاش انسان نہ ہوتا۔ یہ سن کر حضرت عمر نے فرمایا کاش میں اپنے گھر والوں کا مینڈھا ہوتا جو مجھے ہر ممکن طریقہ پر موٹا کرتے اور جب میں تیاری پر آجاتا تو وہ مجھے اپنے مہمانوں کے لیے ذبح کرتے اور میرے بعض حصّے کے کباب بناتے اور بعض حصوں کا سالن تیار کر کے مجھے کھا جاتے مگر کاش میں انسان نہ ہوتا۔ رومی نے دونوں بزرگوں کی باتیں نقل کی ہیں یہ پڑھنے والے کا کام ہے کہ سوچے اس گفتگو سے پہلے کن باتوں کا ذکر ہوگا مگر دونوں نے اپنی غلطیوں اور ان کے نتائج کا کتنا بھیانک تصور کیا ہوگا جس کے بعد بے قرار ہو کر

درخت و جانور بننے کی تمنّا کی جا رہی ہے اور اللہ کی دی ہوئی شرافت انسانیت کو ناقابل برداشت بوجھ قرار دیا جا رہا ہے ادنیٰ عقل و ہوش کا انسان بھی سوچنے پر مجبور ہے کہ کچھ ایسے کام ضرور کئے تھے جس کے حساب سے خوفزدہ تھے اور چاہتے تھے کہ مینگنی اور کباب بن جاتے مگر حساب اور اس کے عتاب سے بچ جاتے ایسی زندگیوں کا خاتمہ حسرت ہی پر ہوسکتا ہے۔

ملاحظہ ہو تاریخ الخلفاء وسیوطی مطبوعہ محمدی لاہور کے صا۹ پر درج ہے کہ حضرت عمر ابولولو کے خنجر سے زخمی ہوئے اور آپ کو نبیذ پلائی گئی جو بعینہ زخم سے باہر آگئی جس کے بعد اعلان ہوگیا کہ اچھا ہونا ناممکن ہے تو لوگ تعریفیں کرنے لگے کہ آپ ایسے تھے تو حضرت عمر نے فرمایا۔ اما واللہ وددت انی منہا کفافا لا علی ولا لی وان صحبۃ رسول اللہ علیہ وسلم سلمت لی واثنی علیہ ابن عباس فقال لو ان لی طلاع الارض ذھبا لافتدیت بہ من حول المطلع ۔ خدا کی قسم اگر دنیا سے جاتے وقت میں برابر چھوٹ جاؤں کہ زندگی بھر کے اعمال کے عوض میں نہ مجھے کوئی ثواب ملے اور نہ کسی عذاب میں ڈالا جاؤں بس آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صحبت کا شرف میرے لیے آخرت کے واسطے بچ رہے تو بڑی بات ہے حضرت عمر کے اس فرمانے کے بعد جب ابن عباس نے ان کی تعریف کی تو فرمانے لگے اے ابن عباس میرا یہ حال ہے کہ تمام روئے زمین سونا ہو جائے اور میں اس کا مالک ہو جاؤں تب بھی میری خواہش ہوگی کہ یہ دولت دے کر ان حالات سے بچ جاؤں جو مرنے کے بعد مجھے پیش آنے والے ہیں۔

حضرت عثمان چونکہ اچانک قتل ہو گئے لہٰذا ان کی زندگی کی آخری گفتگو قاتل سے تکرار تھی تاریخ ان کے تاثرات پیش کرنے کا موقع نہ پا سکی البتہ آپ

نصائح کافیہ صفحہ ۵۵ قال ابن سیرین بلغنا ان معاویہ لما حضرته الوفاۃ جعل یقول یومی منک یا حجر طویل - امیر معاویہ جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر عابد وزاہد صحابی حجر بن عدی کو اس جرم میں قتل کیا تھا کہ وہ جناب امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے بیزاری ظاہر کرنے پر تیار نہیں ہوتے تھے - وقت موت امیر معاویہ بار بار کہتے تھے کہ اے حجر تمھاری وجہ سے ! جس کا دن (موت) بڑی کشاکش کا ہو گیا ہے -

قتل صحابی پیغمبر پر اظہار تاسف کرتے ہوئے وہ امیر معاویہ دم توڑتے ہیں جن کا فرزند یزید قتل فرزند پیغمبر پر مالی وللحسین کہتے کہتے مرتا ہے باپ صحابی ہو کر صحابی رسولؐ کا قاتل بیٹا فرزند صحابی ہو کر فرزند پیغمبر کا قاتل اور دونوں اپنے اعمال قبیحہ پر ماتم کرتے ہوئے مرتے ہیں - باپ بیٹے کی زندگی میں کتنا مکروہ اتحاد ہے اس سے سبق لینا اور مہلک عقیدت سے بچنا ہر ذی ہوش کا فرض ہے -

مضمون کو طول سے بچاتے ہوئے اس حصہ کو یہاں پر ختم کر کے اب آپ کے سامنے کتب حضرات اہل سنت ان ذوات مقدسہ کی زندگیوں کی شام کے تذکرے پیش کیے جاتے ہیں جہاں اجالے ہی اجالے ہیں روضۃ الاحباب میں درج ہے کہ جب جناب امیر علیہ السلام علیہ الصلوٰۃ والسلام ابن ملجم ملعون کی مہلک تلوار سے زخمی ہوتے ہیں تو بے ساختہ فرماتے ہیں فزت برب الکعبہ - رب کعبہ کی قسم میں امتحان بندگی میں کامیاب ہو گیا کعبہ میں جس زندگی کی صبح ہوتی ہے خانہ خدا میں اس کی شام ہوتی ہے - کتنی مقدس ہیں اس زندگی کی سرحدیں -

امام حسین علیہ السلام کی مندرجہ ذیل گفتگو صاحب روضۃ الاحباب کی زبانی سنئے -

اے شمر بے حیائی مکن وزمانے از سر سینہ من برخیز کہ وقت نماز است تا من

رو بہ قبلہ آرام و نشستہ دوگانہ بگذارم وچوں مرا میراث از پدر راست کہ در نماز زخم خورم آنزمان کہ من در نماز باشم ہر چہ خواہی کن - جب شمر ملعون قتل کا ارادہ کرتا ہے تو امام حسین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اے شمر میرے سینے سے اتر جا کیونکہ نماز کا وقت ہے تاکہ میں قبلہ رخ ہوکر بیٹھے بیٹھے ہی سہی نماز پڑھ لوں کیونکہ مجھے میرے باپ سے میراث میں نماز میں قتل ہونے کا شرف ملا ہے - لہٰذا مجھے اس وقت قتل کر جب میں نماز میں ہوں - بیٹا باپ کی شام زندگی پر کتنا نازاں ہے اور جناب امیر و جناب سید الشہداء بوقت موت کس قدر مطمئن ہیں سرور و اطمینان گواہ بن کر زندگیوں کو بھٹکنے سے بچا رہا ہے - زیادہ وقت صرف ہو جائے گا اگر میں تمام ائمہ علیہ السلام کے حالات زندگی لکھوں - موضوع مکمل اور مضبوط کرنے کے لیے بطور حرف آخر ذیل میں چند محبان آل محمدؐ کے حالات لکھے جاتے ہیں جس سے ہر عاقل و بصیر محسوس کرے گا کہ جب پیرو ایسے ہیں تو امام کیسے ہوں گے۔

جناب حجر بن عدی جو جناب امیرؑ پر تبرا نہ کرنے کے باعث معاویہ کے حکم پر قتل کئے جاتے ہیں جب جلاد ان کو قتل کرنا چاہتا ہے دو رکعت نماز پڑھنے کی مہلت مانگتے ہیں اور دو رکعت نماز نہایت اختصار سے پڑھتے ہیں اور فرماتے ہیں اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ تم لوگ سمجھو گے کہ میں نے نماز کو موت سے بچنے کا حیلہ بنایا ہے تو کبھی اتنی مختصر نماز نہ پڑھتا۔

ملاحظہ ہو نصائح کافیہ صفحہ ۵۸

تاریخ کامل جلد ۴ صفحہ ۱۴ پر ہے کہ جب جلاد جناب مسلم ابن عقیل کو دارالامارہ کی چھت پر قتل کے لئے لے کر چڑھا تو آپ تسبیح و استغفار میں مصروف تھے اور اسی حالات میں جلاد کی تلوار نے اپنا کام پورا کیا۔

تاریخ کامل جلد ۴ صفحہ ۲۱ پر درج ہے کہ جب امام حسینؑ نے اپنا خواب

بیان فرمایا جس میں آنے والی موت کا تذکرہ تھا جناب علی اکبرؑ نے فرمایا کہ ہماری موت حق پر ہوگی یا نہیں اور جناب امام حسین علیہ السلام نے فرمایا کہ ہماری موت حق پر ہوگی نوجوان بیٹا اپنے بوڑھے باپ سے کہتا ہے اذاً لا نبالی ان نموت بحق کہ جب حق پر مرنے کا موقع مل جائے تو پھر کسی بات کی فکر نہیں امام بیٹے کو جزاک اللہ کے لفظ سے اپنی پسندیدگی کی سند دیتے ہیں ۔ غرض کہ اس گھر بلکہ اس جماعت میں شب آفتاب ہیں یہاں نہ صبح زندگی میں اندھیرا ہے نہ شام زندگی میں تاریکی ہے ۔ البتہ جو دیکھ کر آنکھ بند کرلے اس سے نہ کچھ کہنا ہے اور نہ کہنا ممکن ہے ۔

مظلوم آقاؤںؑ کی محنتوں کو بربادی سے بچائیے

تنظیم المکاتب جس کا مقصد دینی تعلیم ہے۔جس کے ذرائع آمدنی رقوم شرعیہ (زکوٰۃ۔فطرہ۔خمس۔امام ضامن۔چرم قربانی وعقیقہ اور دیگر رقوم خیرات وصدقات) ہیں جس کے قیام کو ابھی صرف ۱۶ سال ہوئے ہیں۔

دنیاوی تعلیم کا مقصد صرف حصول معاش ہے اور دینی تعلیم کا مقصد دنیا میں مہذب۔متدین اور شریفانہ زندگی بسر کرنا ہے۔اور آخرت میں پابندی دین کے ذریعہ جنت حاصل کرنا ہے۔دنیاوی تعلیم کے بغیر دنیا بسر ہو سکتی ہے آج کاشتکاروں۔تاجروں۔صنعت کاروں۔سرمایہ کاروں مزدوروں کی اکثریت دنیاوی تعلیم سے محروم ہے مگر دونوں ہاتھوں سے دنیا کما رہی ہے۔جب وزیروں کا باقاعدہ تعلیم یافتہ ہونا ضروری نہیں ہے اور وزیر ساز و وزیر گر انگوٹھا چھاپ ہو سکتے ہیں تو پھر کون جاہل اس دنیا کے سفر کو طے نہیں کر سکتا ہے۔البتہ ڈاکٹروں۔انجینروں۔دانشوروں کلرکوں کا ایک جم غفیر ضرور ہے جو تعلیم کے ذریعہ روزی روٹی کما رہا ہے مگر ان پر جاہل ہی حکمراں ہیں یہ اپنا علم بیچ رہے ہیں اور ان کے علم کا اصل نفع جاہل حاصل کر رہے ہیں۔جس طرح مزدور اور کاریگر کی اصل محنت کا فائدہ کاہل اور جاہل اور انسانیت سے غافل سرمایہ دار

حاصل کرتے ہیں دنیاوی تعلیم ضروری ہے اور بیشک ضروری ہے مگر صرف دنیاوی تعلیم کا حشر ہم آپ دیکھ رہے ہیں کہ تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ دونوں طرح کے افراد ایمانداری ۔ رحم ۔ انصاف ۔ قربانی ۔ ایثار ۔ مساوات غرضکہ ہر خوبی کردار سے خالی اور عاری ہیں اور تعلیم یافتہ افراد پر غیر تعلیم یافتہ افراد سوار اور حکمران ہیں ۔ اور جاہل دنیا حاصل کرنے میں تعلیم کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے ۔

اس کے برخلاف دینی تعلیم ہر شخص کے لئے ضروری اور لازم ہے کسی عورت ۔ مرد ۔ بچے ۔ بوڑھے جوان ۔ تعلیم یافتہ ۔ غیر تعلیم یافتہ فرد کو دینی تعلیم سے استثنا نہیں مل سکتا ہے ۔ جو دینی تعلیم سے محروم رہے گا وہ اپنی پابندی سے محروم رہے گا ۔ اور دینی پابندی سے محروم شخص کو نہ صرف جنت سے محروم ہونا پڑے گا بلکہ قبر سے محشر تک عذاب کا سامنا کرنا ہوگا اور محشر کے بعد دوزخ اس کا ٹھکانا ہوگا ۔ دینی تعلیم اور دینی پابندی سے محروم شخص کو دنیا میں کوئی چیز ظلم ۔ جبر ۔ تشدد ۔ بدکرداری ۔ بدکاری بے ایمانی سے نہیں روک سکتی ہے ۔ دنیا میں شرافت کی بحالی کا کوئی راستہ دینی تعلیم کے علاوہ نہیں ہے ۔ اور آخرت میں نجات ۔ بخشش ۔ مغفرت شفاعت اور جنت کا حاصل ہونا دینی تعلیم اور دینی پابندی کے بغیر ناممکن ہے ۔ قرآن مجید کی درجنوں آیتوں میں اور چودہ معصومین علیہم السلام کی سینکڑوں حدیثوں میں اس بات کی صراحت اور وضاحت موجود ہے کہ آخرت صرف پابند دین ۔ متقی اور پرہیزگار افراد کو حاصل ہوگی ۔ سارے کار خیر ۔ ساری عبادتیں ۔ سارے اعمال صرف متقی اور پابند دین افراد کے قبول ہوں گے ۔ ہمارے ائمہ معصومین علیہم السلام بھی صرف متقی اور

پابند دین افراد کا امام ہونا پسند فرماتے ہیں۔ خدا۔ نبیؐ۔ امامؑ سب ان افراد پر غضبناک ہیں جو دامے۔ درمے۔ قدمے۔ سخنے کسی طرح بھی دین کی مخالفت کرتے ہیں۔ دین کی توہین کرتے ہیں۔ دین کا مذاق اڑاتے ہیں۔ دین کا منکر تو کافر ہی ہے لیکن دین کو ماننا اور اس کے احکام کو نہ جاننا۔ جاننا اور نہ ماننا۔ خلاف ورزی کرنا اور خوف خدا سے دل کا خالی ہونا۔ خلاف ورزی کو جاری رکھنا اور سمجھانے والے سے لڑ جانا۔ بات سننے کے بجائے بیجا بحثیں کرنا سمجھانے والے کو بدنام کر کے جھوٹے الزام لگا کر بے اثر کرنا۔ اپنی من مانی کو باقی رکھنے کے لئے دینی تعلیم کی مخالفت کرنا۔ دینی پابندی پر پابندی لگانا۔ ———— صرف دین کی توہین کرنا ہے۔ دین کا مذاق اڑانا ہے۔ صرف خدا کو غضبناک کرنا ہے اور دین۔ دینی تعلیم اور دینی پابندی کے لئے اپنا سب کچھ لٹا دینے والے معصومین علیہم السلام کو صرف اذیت پہنچانا ہے۔ ان کی محنتوں کو برباد کر کے ان کو دکھ پہنچانا ہے۔

اس دنیا میں تو ہر شخص جو چاہے کر لے۔ لیکن کل اس کو اپنے اعمال کے کٹھرے میں کھڑا ہونا پڑے گا۔ خدا کے غضب اور معصومین علیہم السلام کی نفرت کا شکار ہونا پڑے گا۔ اور حساب و کتاب کے بعد اپنے اعمال اور کرتوت کی سزا بھگتنا ہو گی۔ یہ قرآنی حقائق ہیں۔ یہ معصومین علیہم السلام کے ارشادات ہیں۔ ہم کو نہ بھولنا چاہیئے کہ ہم ہر سکنڈ اپنی موت سے آنے والی قیامت سے اور حضرت حجتؑ کے ظہور سے قریب ہو رہے ہیں۔ ہم کو درپیش ان تینوں مرحلوں کی تیاری جلد از جلد کرنا چاہیئے۔ اور تیاری صرف پابندی دین ہے جو بغیر واقفیت دین نا ممکن ہے۔ اور سارا دین

صرف قرآن مجید واحادیث معصومینؑ میں ہے جس کا علم اور جس کی واقفیت صرف فقیہ کو ہوتی ہے لہٰذا فقیہ کی تقلید کے بغیر دین کا جاننا ناممکن ہے خوش فہمی اور بات ہے اس لئے خود اپنے ساتھ۔ اپنے خاندان کے ساتھ۔ اپنے حلقہ اعزا واحباب کے ساتھ۔ تمام مسلمانوں اور مومنین کے ساتھ محبت صرف یہی ہے کہ گاؤں گاؤں۔ محلے محلے۔ شہر شہر۔ دینی تعلیم کے۔ مکاتب اطفال۔ مکاتب شبینہ (نائٹ کلاسز) مکاتب نسواں۔ گشتی مکاتب۔ پرائمری مکاتب قائم کئے جائیں۔ ہر شخص کو مفہوم تقلید سے واقف کرایا جائے۔ دینی سوالات وجوابات کے لئے اجتماعات کئے جائیں۔ ہر مجلس کے بعد ہر نماز جماعت کے بعد۔ ہر محفل کے بعد مسائل پوچھے جائیں۔ مسائل بتائے جائیں۔ جن مسائل کے جوابات نہ معلوم ہوسکیں ان کو ہندوستان کے علمی مرکزوں سے یا قم اور نجف اشرف سے معلوم کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ مذہبی لٹریچر ہر اس زبان میں شایع کیا جائے جن زبانوں میں مومنین پڑھتے۔ لکھتے اور بولتے ہیں۔

ضرورت ہے کہ ہم جلد از جلد اپنے کو اس قابل بنالیں کہ جس وقت بھی ظہور ہو ہم حضرتؑ کے لئے کارآمد اور مفید ہوں۔ مضر اور رکاوٹ نہ ہوں۔ دینی تعلیم کو پھیلتے دیکھ کر۔ دینی پابندی کے رجحان کو بڑھتے دیکھ کر اسلام اور اسلامی انقلاب کے مخالف۔ عراقی ایجنٹ بوکھلا گئے ہیں اور اور اپنے اقتدار کی کشتی کو ڈوبتا دیکھ کر مسلمانوں میں انتشار۔ افتراق اور نفاق پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اختلافات کی لہر لانے کے لئے کوشاں ہیں۔ ان سے صرف ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے اور بس۔ ان کا علاج خدا کرے گا ہمارا کام ہے دینی تعلیم کو عام کرنا۔ تقلید کے مفہوم کو سمجھانا

اور مزاج تقلید کو عام کرنا اور دینی پابندی کو ہر گوشہ تک پہنچا دینا۔ کام کے لئے صرف جذبہ کی ضرورت ہے۔ سرمایہ موجود ہے۔ امام ضامن۔ قربانی و عقیقہ کے کھال کی قیمت۔ خیرات و صدقات۔ فطرہ۔ زکوٰۃ اور اعلم کی اجازت کے بعد خمس کا سہم امام علیہ السلام دینی تعلیم۔ دینی مکاتب دینی لٹریچر پر صرف کیجیے جن مالی واجبات کو ادا کرنا مذہب نے لازم قرار دیا ہے۔ جن کی عدم ادائگی کی صورت میں دوزخ کی آگ کا سامنا کرنا ہوگا۔ ان مالی واجبات کو پہلے خود نکالئے پھر دوسروں کو آمادہ کیجئے۔ اس طرح دنیا میں خوش حالی اور آخرت میں شادمانی حاصل کیجئے۔ اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی قربانیوں اور محنتوں کو ضایع و برباد کرنے والوں کو شکست فاش دیجئے اور ان مظلوم آقاؤںؑ کی دعائیں لیجئے۔

راہ تبلیغ کے شہید ابوذر غفاری علیہ الرحمۃ

حق بات کہنا آسان کام نہیں ہے۔ کیونکہ عموماً حق کڑوا ہوتا ہے اور کوئی کڑوی بات سننے پر راضی نہیں سوا ان لوگوں کے جو حق کو شہد سے زیادہ میٹھا سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ بڑے شوق سے حق بات سنتے ہیں بلکہ حق کہنے۔ حق سننے حق ماننے۔ حق دینے۔ حق دلانے۔ حق لینے کا ذوق رکھتے ہیں۔ مگر ایسے لوگ گنے چنے تھوڑے سے لوگ ہوتے ہیں ورنہ آج کی دنیا میں ناحق کا اتنا زور ہے کہ رشوت لینے والے رشوت طلب کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم کو ہمارا حق دلوائے یعنی مال حرام کا نام حق پڑ گیا ہے۔

مذہب نے حق بات کہنے کو بے حد اہمیت دی ہے۔ چنانچہ مخالف اور ظالم کے سامنے حق کہنا عظیم عبادت بھی ہے۔ اور جہاں حق کی خلاف ورزی ہو رہی ہو وہاں خاموش رہنا اور حق ظاہر نہ کرنا۔ حق کی حمایت نہ کرنا بھی عظیم جرم ہے جس کا عذاب بھی عظیم ہے۔ اگر حالات میں باطل کے سامنے حق کا اظہار ممکن نہ ہو تو وہاں سے اٹھ جانا واجب ہے۔ اگر اٹھنا بھی ممکن نہ ہو تو چہرہ کے ذریعہ ناگواری کا مظاہرہ واجب ہے۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تب بھی لازم ہے کہ دل بھرپور باطل سے بیزار ہو اور حق کی حمایت کے لئے بیتاب ہو اس قلبی کیفیت کی اہمیت دلوں کا حال جاننے والے خدا و نبیؐ و امام کے دین میں بہت زیادہ ہے۔ ہم کو اپنا دل ٹٹولنا چاہیے کہ ہم حق کی ہر حال میں

حمایت کرتے ہیں یا نہیں اور بہر حال باطل سے بیزار رہتے ہیں یا نہیں۔ کل محشر میں پچھتانے کے بجائے آج اپنی زندگی کی پوری جانچ پڑتال کرتے رہنا ضروری ہے۔

مگر جہاں حق کی حمایت اور باطل سے بیزاری کی خدا و نبیؐ و امامؑ کی نظر میں غیر معمولی اہمیت ہے۔ وہاں اس باطل پرست دنیا میں سچ بولنے کی نہایت درجہ سخت اور کڑی سزا بھی دی جاتی ہے۔ اور اس ظلم کا شدید ہدف اور نشانہ وہی بنتا ہے جو حق کی تبلیغ میں شدید ہوتا ہے۔ چنانچہ انبیاء اور آئمہ علیہم السلام پر سب سے زیادہ ظلم کے پہاڑ توڑے گئے کیونکہ ان کا جرم صرف تبلیغ کرنا تھا۔ معصومین کے علاوہ غیر معصوم افراد نے بھی اس راہ میں غیر معمولی قربانیاں دی ہیں اور غیر معمولی مصائب کا شکار ہوئے ہیں۔ اسلاف اپنا حق ادا کر چکے۔ اگلی نسلیں اپنا حق ادا کریں گی اور ماضی و مستقبل کے تبلیغ چور اپنی سزا بھگت رہے ہیں اور بھگتیں گے۔ البتہ آج کے ہم ذمہ دار ہیں۔ آج ہم کو اپنی ذمہ داری ادا کرنا ہے ورنہ صالحین سے ہمارا رشتہ ٹوٹ جائے گا اور عذاب الٰہی ہم کو گھیر لے گا۔

دنیا کی نظر میں کل بھی تبلیغ کرنا جرم تھا آج بھی جرم ہے۔ کل بھی جرم رہے گا مگر کل بھی تبلیغ کرنے والے رحمت خدا کے حق دار تھے اور آج بھی حقدار ہیں اور کل بھی حق دار ہوں گے۔ لیکن ہم کو دو میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہے یا ہم تبلیغ کریں اور گالیاں کھائیں۔ بدنام ہوں دشمنی مول لیں۔ بے سر و پا جھوٹے الزامات کے بوجھ تلے دبائے جائیں مگر رحمت خدا اور شفاعت نبیؐ و آل نبیؐ حاصل کریں۔ یا تبلیغ سے منھ موڑ لیں اور عذاب الٰہی و غضب معصومین علیہم السلام کا سامنا کریں۔ کل جب کہ دین کی بات سنی نہیں جاتی

تھی۔ شاید کل کے خاموش افراد معذور قرار پا جائیں لیکن آج جب زمانہ بڑے شوق سے دین کی بات سن رہا ہے اور کان دھر رہا ہے ایسے میں جو خاموش رہا۔ جس کی زبان، جس کا قلم۔ جس کا عمل خاموش رہا اسے کہیں پناہ نہ ملے گی۔ آج کے حالات میں بہرحال ہم کو اپنی آج کی ذمہ داریاں پوری کرنا ہوں گی چاہے ہم بوڑھے ہوں یا جوان۔ عورت ہوں یا مرد۔ عوام ہوں یا خواص غرضکہ جو بھی قوم کا جز ہے جو بھی دین کا ماننے والا ہے جو بھی سماج میں شامل ہے اسے بہرحال اپنی تبلیغی ذمہ داریاں پوری کرنا ہیں انسان ذمہ داریوں کا مذہبی نام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے یعنی نیکی کی ہدایت کرنا اور برائی سے روکنا۔

کبھی کبھی ایسی حیرت انگیز باتیں ہوتی ہیں جن کو انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔ چنانچہ اس عہد کا عجوبہ یہ ہے کہ مومنین کو تبلیغ کے موضوع پر ایک دوسرے سے ٹکرا دیا گیا ہے اور ہادی خدا اور سربراہ تبلیغ نبیؐ اور امامؑ کے مذہب میں تبلیغ کو جرم قرار دینے کی جسارت کی جارہی ہے۔

اس موضوع پر جناب ابوذر غفاری کی ذات گرامی فیصلہ کن ہے۔ جنھوں نے شام سے مدینہ منورہ تک تبلیغ کی۔ حکومت کے غاصب و قابض ہونے کا اعلان کیا اہلبیتؑ علیہم السلام کی حاکمیت کی بھرپور تبلیغ کی۔ دین مبین اہلبیت علیہم السلام جو اسلام حقیقی ہے کی اتنی تبلیغ کی کہ دشمن ملک شام میں اہلبیت علیہم السلام کے اتنے ماننے والے پیدا ہوئے کہ آج بھی لبنان اور شام میں مومنین کی عظیم آبادیاں پائی جاتی ہیں۔ جہاں سے نامور علما پیدا ہوئے اور اس علاقہ نے غیر معمولی مذہبی لٹریچر فراہم کیا۔ آج بھی اسلامی انقلاب کا دوسرا وطن وہی علاقہ ہے جو کل ابوذر علیہ الرحمہ کا حلقۂ تبلیغ تھا۔ جناب ابوذرؓ

نے ہر حاکم اور غیر حاکم مسلمان کو عدم پابندی دین پر قدم قدم پر ٹوکا۔ تعمیرات ولباس وعادات واطوار غرضکہ ہر غیر اسلامی زندگی کو اپنی تبلیغ کا نشانہ بنایا۔ شامی حکومت دھل گئی۔ تخت حکومت ڈولنے لگا۔ ابوذرؓ کو تبلیغ کی کڑی سزا دی گئی۔ اونٹ کی ننگی پیٹھ پر بٹھائے گئے۔ اونٹ بے تحاشہ ہنکایا گیا۔ راستہ میں رانوں کا گوشت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر گیا۔ ہڈیاں ٹوٹ گئیں اس حال میں مدینہ منورہ پہنچے۔ مگر تبلیغ جاری رکھی۔ یہاں تک کہ ربذہ کی طرف جلا وطن کئے گئے۔ بیوی اور بیٹے کی موت کے بعد تین دن کے فاقہ کی حالت میں آیت کے تکیہ وبستر پر موت کا استقبال کیا۔ اپنے بعد صرف ایک بیٹی چھوڑی جس نے ایک عراقی قافلہ کی مدد سے اپنے باپ کے آخری امور انجام دلائے۔ قافلہ سردار مالک اشتر تھے۔ ابوذرؓ اگر صرف خاموش ہو جاتے تو عتاب سلطانی کا شکار نہ ہوتے۔ مگر ابوذرؓ نے زندگی بھر کڑوے گھونٹ پی لئے مگر عقیدہ وعمل کے کسی مسئلہ پر خاموش نہیں ہوئے۔ عتاب سلطانی کے شکار ابوذرؓ کو جناب امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب علیہ السلام نے حسنینؑ اور عمار یاسر جیسے اصحاب رسولؐ کے ہمراہ مدینہ سے رخصت کر کے تبلیغ کی بھرپور قدردانی کی۔ ہمت افزائی کی۔ اور ہم کو بتلایا کہ امامت کا چہیتا اور پیارا وہی ہوتا ہے جو مکمل پابندی دین کی تبلیغ کرتا ہے چاہے حکومت اور اہل دنیا اس کے ساتھ کتنا ہی خراب برتاؤ کیوں نہ کریں آج روح ابوذرؓ علیہ الرحمہ ہم سب سے مکمل پابندی دین کی تبلیغ کا تقاضا کر رہی ہے۔ کیا ہم ابوذرؓ کی روح کو رنجیدہ کر سکتے ہیں۔

اسلامی انقلاب کے چراغ کی روشنی باقر صدرؒ کے خون سے پیدا ہو رہی ہے

میرے سامنے ۱۹۸۲ء کا تنظیم المکاتب کا کلنڈر لٹکا ہوا ہے۔ جس کے بیچوں بیچ شہید خامس آقائے باقر صدر کی تصویر ہے تصویر کے ایک طرف معصومین علیہم السلام کی تاریخہائے شہادت و ولادت ہیں اور دوسری طرف بارہ مہینوں کی سعد و نحس تاریخیں یکجا کر دی گئی ہیں میں باقر صدر کو دیکھ رہا ہوں۔ اور میرا یہ احساس بڑھ رہا ہے کہ وہ نہ صرف مجھے دیکھ رہے ہیں بلکہ ان آنکھوں سے مجھے پیغام نشر ہوتے محسوس ہو رہے ہیں۔ ان کو شہید خامس (پانچواں شہید) اس لئے کہا جاتا ہے کہ آگرہ میں شہید ثالث ہیں اور دہلی میں شہید رابع ہیں۔ باقر صدر ان کے بعد شہید ہوئے ہیں۔ سب کا جرم حمایت حق میں کتابیں لکھنا ہے۔

شہید اول و ثانی بھی اسی جرم میں شہید کئے گئے اور شہید خامس حمایت حق میں کتابیں لکھنے کے علاوہ اس لئے بھی شہید ہوئے کہ انھوں نے عالمی سطح پر اسلامی انقلاب لانے کی تحریک میں حصّہ لیا۔ ایرانی اسلامی انقلاب میں ان کا جو حصہ ہے اس کی گواہی ایران کا دستور اساسی دیتا رہے گا ایران کے علاوہ شام میں حسن شیرازی اسی تحریک کا ایک جز تھے

مگر شامی حکومت اگر ان کی ہمنوا نہ تھی تو مخالف بھی نہ تھی اس لئے ابھرتے اسلام سے خوف زدہ سپر پاورس نے ان کی شہادت گاہ لبنان کو قرار دیا۔ موسیٰ صدر بھی اسی تحریک کا ایک جز تھے۔ ان کی مخفی شہادت کا راز ابھی تک راز ہے۔ مگر ایک دن ہر قاتل ذلیل ہو کر رہے گا۔

باقر صدر عالمی سطح پر اسلامی انقلاب لانا چاہتے تھے۔ اسلامی انقلاب کے مطلب کو صرف اسلامی حکومت کا قیام قرار دینا۔ اسلامی انقلاب کی قیمت کم کرنا ہے۔ اس کے عمل کے دائرہ کو محدود کرنا ہے۔ اس کے مخالفوں کو مشتعل کرنا ہے۔ اس کے ناواقفوں کو مبتلائے غلط فہمی کرنا ہے۔ بلکہ اسلامی انقلاب کا مطلب یہ ہے کہ ذہن اسلامی بنے۔ انداز فکر اسلامی بنے۔ جذبات اسلامی ہوں لہجہ اسلامی ہو۔ اعمال اسلامی ہوں۔ افراد اسلامی ہوں۔ خاندان اسلامی ہوں۔ اس کے بعد جہاں رکاوٹ نہ ہو گی وہاں اسلامی حکومت خود بخود قائم ہو جائے گی اور جہاں رکاوٹ ہو گی وہاں اسلامی انقلاب اپنے عمل کو تیز تر کرتا رہے گا۔ باقر صدر نے اسی عالمی اسلامی انقلاب کے لئے کوشش کی۔ جس کی تکمیل ہم سب کے آخری امامؑ کو کرنا ہے۔ فلسفتنا۔ اقتصادنا۔ اسلامی بینک جو آقائے باقر صدر کی مشہور ترین کتابیں ہیں ان میں اگر آپ مصنف کے ذہن کو پڑھیں گے تو میری بات کی تصدیق کریں گے وہ پہلے مسلمان کو پھر ہر انسان کو علمی سطح پر اس یقین و ایمان تک پہنچانا چاہتے تھے کہ اسلام زندگی کے ہر علمی و عملی ضرورت کے لئے اصول و طریقۂ عمل کا ایسا مکمل مجموعہ رکھتا ہے کہ اسلام کے علاوہ باہر سے کچھ لینے کی ضرورت نہیں ہے ...

کے بجائے فساد پیدا کرے گا۔

جس طرح صاف شفاف دریا میں ملوں کے کیمکل فضلات کے ملنے سے پانی خراب اور مضر ہو جاتا ہے اسی طرح اسلام کے آب صافی کو عصری فلسفوں کے سائنسی فضلات سے آلودہ کر کے زہریلا بنا دیا جاتا ہے۔ شہید خامس ممزوج اسلام کو مقطر کرنا چاہتے تھے۔ علمی سطح پر کام کو آگے بڑھا چکے تھے۔ ان کی کتابیں پھیل چکی تھیں جن کی روشنی میں برابر کتابیں لکھی جا رہی تھیں۔

شہید خامس کے شاگرد پوری دنیا میں چراغ پر چراغ جلاتے رہے تھے۔ باقر صدرؒ نے آقائے حکیم طاب ثراہ کے آخری عہد میں محسوس کر لیا کہ عراق کے مرکز علم کو۔ بعثی حکومت ختم کرنا چاہتی ہے۔ ایران میں امریکہ عراق میں روس نے مل کر اسلام کو سولی پر لٹکانے کا انتظام شروع کیا۔ مومنین قتل ہونے لگے۔ علماء جلاوطن ہونے لگے۔ نجف خالی ہونے لگا۔ آقائے حکیم کو اگر بغداد کے اسپتال میں زہر نہیں بھی دیا گیا ہو تو بھی حوزہ علمیہ نجف کے اجاڑنے کا خنجر ان کو ایسا مارا گیا تھا۔ جس نے ان کی جان لے لی۔ ان کی زندگی میں بھی باقر صدر قید کئے گئے۔ پھانسی کا حکم ہوا مگر بعثی حکومت کو محسوس ہوا کہ ابھی یزیدی عہد دور میں دیر ہے۔ لہذا رہا کر دیئے گئے۔ آقائے حکیم انتہائی غمگین حالت میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔

آقائے خوئی علمی دنیا کے سربراہ ہونے کے باوجود انقلابی تحریک کی سربراہی کے حالات نہ رکھتے تھے۔ آقائے خمینی بھی عراق میں بے بس تھے مگر وہ ایران کو جگا رہے تھے۔ جب اسلامی انقلاب کی آہٹ سیر یا دریں

کو محسوس ہوئی تو وہ گھبرا اٹھیں۔ ایران نے ان کو خاک چٹا دی تھی لہٰذا روس و امریکہ رقیب ہوتے کے باوجود عراق کی بعثی حکومت کے یار اور آشنا ہو گئے۔ امریکہ کے غلام عرب بھی حق غلامی ادا کرنے کے لئے جمع ہو گئے۔ بعثی حکومت روس۔ امریکہ سب کی داشتہ بن گئی۔

اسلامی انقلاب کو دیکھ کر اسرائیل کا حال سب سے برا تھا۔ اور امریکہ اپنے اکلوتے ولدالزنا کی پریشانی دیکھ کر بدحال ہوا جا رہا تھا۔ لہٰذا روس اور امریکی سامراج اپنے پروگرام پر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ملعون رضا شاہ اور صدام نے مل کر اسلامی انقلاب کو چکنا چور کرنا چاہا تھا۔ مگر آقائے خمینی عراق سے ایران پہنچ گئے اور رضا شاہ فرعون کے پہلو میں پہنچ گیا۔ آج سادات بھی اپنے مہمان کے پاس ہے اور دونوں اپنے جگری دوست صدام کے منتظر ہیں۔ انشاءاللہ صدام اور صدام کے ساتھ نصف درجن شاہ و شیخ بھی پہنچنے والے ہیں۔

غرضکہ ایران کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد اسلامی انقلاب کے خلاف عراق ہی کو مہرہ بنایا جا سکتا تھا۔ لہٰذا عراق کو ہر مسلمان سے خالی کرانا ضروری تھا۔ بعثی حکومت نے ۲۰ سال میں اسلام اور مسلمانوں کو جلا کر خاک کر ڈالا۔ مگر مجاہد اعظم نے حزب دعوۃ کے نام ایک جماعت کی بنیاد ڈالی۔ اور اسلام کے خاکستر سے پھر زمین اسلام کی تعمیر کی کوشش میں لگ گئے۔ سب چلے گئے مگر باقر صدر نے کہا کہ عراق صرف میرے خون بہنے کے بعد ہی بیدار ہو گا لہٰذا مجھے یہاں رہنا ہے۔ ۱۲ ہزار چنے ہوئے افراد باقر صدر کی شہادت کے قبل اکا دکا قتل کئے گئے۔ باقی عراق سے باہر نکل پڑے یا آج تک جیل میں ہیں یا جیل

ہی ان کا قبرستان بن گئی - باقر صدرؒ صبح شہادت مسکراتے ہوئے اپنے خادم کے پاس آئے اور اپنا خواب بیان کیا کہ آج میری شہادت کا دن ہے - بھائی کے ساتھ بہن نے بھی بنت الہدیٰ کے قلمی نام سے عراقی عورتوں میں بیداری کی لہر پیدا کی تھی دونوں اذیت دے دے کر شہید کئے گئے خنجر - شکنجہ - آگ ہر اذیت کا استعمال کیا گیا - شہید کا عمامہ - عبا ان کے استاد آقائے خوئی کے پاس بھیج دیا گیا - لاشیں جو جلی ہوئی تھیں - گمنام جگہ پر دفنا دی گئیں - آج شہید کی بیوہ ایک کمسن لڑکی اور لڑکے کو لے کر شہید کے بھتیجے کے پاس کاظمین میں مقیم ہے - جس کا بھائی موسیٰ صدر بھی شہید ہو چکا اور شوہر بھی شہید ہو چکا - مگر آج بھی حزب دعوۃ کے لوگوں کو صدام یزیدؔ پھانسی دیتا رہتا ہے - جو اس بات کی دلیل ہے کہ باقر صدر زندہ ہیں اور بعثی حکومت اب بھی خوف زدہ ہے - عرب - یورپ امریکہ - فرانس - برطانیہ - روس - اسرائیل سب عراق کی مدد کر رہے ہیں مگر نہ صرف ایران اپنی جگہ پر کھڑا ہے بلکہ آگے بڑھ رہا ہے اور عراق لڑکھڑاتا جا رہا ہے - ایران میں تو انقلاب کامیاب ہو چکا - کئی امتحانی دوروں سے گذر چکا مگر باقر صدر کی شہادت نے مقہور و مجبور مومنین عراق کے لہو میں جوش پیدا کیا تھا وہ نہ سرد ہوا ہے نہ ہو گا - اپریل میں باقر صدرؒ شہید ہوئے - ہر مسلمان اور اسلامی انقلاب کے حامی کا فرض ہے کہ وہ اس ہفتہ میں شہید کے لئے مجلس عزا کرے - اسلامی انقلاب کی حمایت میں جلسہ کرے - جلوس نکالے تاکہ اسلامی انقلاب کی جڑیں پھیلتی جائیں آقائے خمینیؒ کو صفین و نہروان کی کامیابی ملی - باقر صدرؒ کو کربلا کی کامیابی ملی - دونوں کامیاب ہیں - دونوں ایک دوسرے سے مربوط ہیں - دونوں

ایک دوسرے کا سبب بھی ہیں اور نتیجہ بھی ہیں۔

آج دنیا میں جگہ جگہ نئے خمینی و باقر صدر پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔ لوگ جوق در جوق میدان شہادت سے باقر صدر سے ملنے جا رہے ہیں۔ کبھی مشرق مغرب سے ڈرتا تھا۔ پھر مغرب مشرق سے ڈرنے لگا تھا۔ پھر دونوں تیسری دنیا کے تصور سے اندیشوں اور خدشوں میں مبتلا ہو گئے تھے۔

آج اسلامی انقلاب سے مشرق۔ مغرب۔ تیسری دنیا سب ہی پریشان ہیں۔ کسی کو خطرہ ہے۔ اسلحہ نہ فروخت ہوئے تو ہم نیلام ہو جائیں گے۔ کسی کو خطرہ ہے کہ کمیونزم کا انسانی ہمدردی کا ملمع اسلامی انقلاب کے باعث بالکل اڑ گیا ہے اور زنگ آلود فولاد افغانستان میں برہنہ ہو گیا ہے۔ غیر جانبدار ممالک اسلامی انقلاب کی دو ٹوک پالیسی سے اس لئے پریشان ہیں کہ اس کے بعد ان کی خوش اخلاقی والی غیر جانبداری کی نقاب کے باوجود خود غرضی اور حمایت ظلم کا چہرہ صاف دکھائی دینے لگا ہے اسلامی انقلاب امریکہ کے کالے گوروں کو متاثر کر رہا ہے۔ اسلامی انقلاب انگلستان کے انسانی ہمدردوں کو اپنی طرف مائل کر رہا ہے۔ اسلامی انقلاب پر مصری قربان ہو رہے ہیں۔ اسلامی انقلاب کے پروانے بحرین سے سعودی عرب تک پیدا ہو گئے اور ہر حکومت کی شمع جھلملا رہی ہے۔

آج اسلامی انقلاب کے چراغ کا نام خمینی ہے اور اس چراغ کی روشنی باقر صدر کے خون سے پیدا ہو رہی ہے۔ آئیے ہم بھی اپنے اپنے ظلمت کدہ دل و دماغ میں باقری و خمینی اجالے پیدا کریں اور ہر سال ہفتہ شہادت منا کر خون شہید کو تازہ رکھیں اور مقصد شہادت کو تابندہ رکھیں۔ خون نہ سہی پسینہ ہی بہا کر اس کارواں میں شامل ہو جائیں جو دمبدم اور قدم قدم جنّت سے قریب ہوتا جا رہا ہے۔

سہاگ اور سوگ شریعت کی نظر میں

انسان میں خوشی اور غم دونوں کی فطری صلاحیت پائی جاتی ہے اور شریعت فطری جذبات کے حدود معین کرتی ہے اس کا گلا نہیں گھوٹتی ہے۔ جس طرح پانی کی فطرت نشیب کی طرف بہتا ہے۔ پانی کو اس کی فطرت سے روکنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن نہر۔ باندھ وغیرہ کے ذریعہ اس کے بہاؤ کے حدود معین کئے جاتے ہیں تاکہ پانی کی فطرت سے فوائد حاصل کئے جائیں اور اس کی بے راہ روی سے پیدا ہونے والی تباہی اور بربادی سے بچا جائے۔

شریعت اسی طرح انسان کے فطری جذبات کے حدود معین کرتی ہے تاکہ ان جذبات کے ذریعہ افراد۔ خاندان۔ معاشرہ۔ ممالک۔ اقوام کو فوائد حاصل ہوسکیں۔ قوتیں تعمیر میں کام آئیں۔ تخریب کا ذریعہ نہ بننے پائیں۔ شریعت کے متوازی ایک اور نظام سوسائٹی قائم کرتی ہے جہاں جذبات کو رسموں کی شکلوں میں اجاگر کیا جاتا ہے۔ لیکن شریعت۔ عالم اور حکیم خدا کی بھیجی ہوئی ہے لہٰذا اس کے احکام تخریب سے روکتے ہیں اور تعمیر میں مدد دیتے ہیں اور سوسائٹی انسانوں کی غیر منظم بھیڑ کا نام ہے لہٰذا اس کے زیر سایہ جو رسمیں جنم لیتی ہیں وہ یا علاقائی ہوتی ہیں یا خاندانی ہوتی ہیں یا طبقاتی ہوتی ہیں۔ ان میں نہ کوئی معقولیت ہوتی ہے نہ افادیت۔ بلکہ ان کو ہوتے رہنا ہیں اس لئے

کہ ہوتی آئی ہیں۔

اجداد پرستی کی اسلام نے شدید مخالفت کی ہے۔ اسلام کی راہ میں آغاز تبلیغ میں جو سب سے بڑا پتھر تھا وہ یہی ہڈی کی پوجا تھی۔ یہی اجداد پرستی تھی۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر خداوند عالم نے کافروں کے اس قول کو نقل بھی کیا ہے اور اس کی شدید مذمت بھی کی ہے کہ کافر کہتے تھے کہ ہم اُسے کیسے چھوڑ دیں جو ہمارے بزرگ کرتے آئے ہیں۔ کیا وہ بے وقوف تھے وغیرہ وغیرہ اور خدا نے ہر بار یہی کہا کہ حق کو مانو ورنہ تم بھی اپنے بزرگوں کی طرح گمراہ رہو گے اور عذاب پاؤ گے۔ یہ ہڈی کی پوجا۔ استخواں پرستی آج بھی کسی نہ کسی شکل میں باقی ہے بلکہ مذہب جس کا استخواں پرستی کا مخالف تھا۔ جس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتا آج وہی بزرگوں کی غلط ریت مذہبی لبادہ پہن کر مذہب کے زیر سایہ پناہ لیتی ہے۔ جس پر ٹوکنے والے۔ جس کی اصلاح کرنے والے کو اکثر غیر مذہبی بلکہ منکر مذہب قرار دیدیا جاتا ہے۔ مگر مرض ہے اور صحت صحت ہے سیلاب امنڈتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے۔ حقیقت باقی رہ جاتی ہے۔ سماج اور سوسائٹی کے سیلاب پیغمبرؐ اور ائمہؑ کے خلاف اُمڈے اور ختم ہو گئے مگر حقائق بہرحال آج بھی باقی ہیں اور باقی رہیں گے۔

رسمیں وہ سولی ہیں جن پر ہزاروں سال سے انسانی سکون اور راحت کو پھانسی دی جا رہی ہے۔ رسمیں وہ تاریک اور تکلیف دہ قید خانے ہیں جن میں کروروں خاندانوں نے تڑپ تڑپ کر جان دی ہے۔

رسمیں وہ شکنجے ہیں جن میں خاندانوں اور انسانوں کو ہزاروں سال سے جکڑا جا رہا ہے انسان بلک بلک کر روتے ہیں مگر ان کو ہنسنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ رسموں کے مہیب غاروں سے جب تک سوسائٹی کو شریعت کے ذریعہ

نہیں نکالا جائے گا اس وقت تک انسان تڑپتا رہے گا اور شیطان قہقہے لگاتا رہے گا۔ رسموں نے آج پیدا ہونا۔ جینا۔ شادی۔ بیماری۔ موت سب کو اتنا مشکل بنا دیا ہے کہ زندگی اجیرن ہے۔ کاش ہم کو اپنے دکھوں کا احساس ہوتا۔

شریعت رسموں کی شدید دشمن ہے۔ لیکن فطری جذبات مسرت وغم کو مظاہرہ کی شکل وصورت دینے کے احکام دیتی ہے۔ تاکہ یہ مظاہرات مسرت وغم رسم کے بجائے عبادت بن جائیں یعنی کرب راحت سے بدل جائے اندھیرے کے بجائے اجالا ہو جائے۔

شریعت نے پانچ مقامات پر دعوت کو مستحب قرار دیا ہے۔ جب بچہ پیدا ہو۔ جب ختنہ ہو۔ جب شادی ہو۔ جب مکان خریدے جب حج سے واپس ہو۔ مگر دعوت میں مومنین خصوصاً غرباء مومنین کو کچھ کھلا دینا ہے۔ اس میں اہتمام۔ تنوع۔ ورائٹیاں۔ اقسام لازم نہیں ہیں بلکہ اسراف ممنوع ہے۔ ساتویں دن مونڈن اور بالوں کے وزن برابر چاندی کا صدقہ دینا مستحب ہے۔ عقیقہ یعنی بچہ کے نام پر جانور کا ذبح کرنا مستحب ہے۔ شادی کے موقع پر عقد کے بعد ازدواجی تعلقات کے وقت یا اس کے بعد ولیمہ یعنی دعوت (شرعی حدود میں نہ کہ سماجی ہر بونگ کے ساتھ) مستحب ہے۔ مذہب نے سہاگ اور سوگ دونوں کو مذہبی حیثیت دی ہے مگر دونوں کے حدود شریعت نے معین کر دیے ہیں۔

سہاگ میں حسب ذیل چیزوں کی حیثیت شرعی ہے۔

(۱) نکاح مستحب ہے یعنی عبادت ہے۔

(۲) متعدد نکاح بھی مستحب ہیں (سماج اس مسئلہ پر لڑنے مرنے پر تیار ہو جائے گا مگر شریعت کی بات نہیں مانے گا مگر سماج سماج ہے شریعت

نہیں ہے اور شریعت میں تحریف و تبدیلی حرام ہے بدعت ہے موجب مذمت و عذاب ہے۔ رہے حالات تو ہمارے حالات میں بہ کثرت طرح طرح کے جنسی گناہ رائج اور جائز ہیں مگر ایک شادی کی بھی گنجائش بہت دیر میں پیدا ہوتی ہے)

(۳) پیغام دینا اور پیغام دینے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھ کر (جو دعا منقول ہے اس کو پڑھ کر) خدا سے ایسی بیوی کا طالب ہونا جو عفیفہ ہو اپنی عفت اور شوہر کے مال کی محافظ ہو۔ جو زیادہ روزی اور زیادہ برکت والی ہو۔ جس سے ایسی اولاد پیدا ہو جو زندگی اور مرنے کے بعد صالح جانشین ہو۔ (اس دعا سے اندازہ ہوتا ہے کہ کن مقاصد اور کن بنیادوں پر نسبت کا انتخاب ہونا چاہئے) اس دعا کے بعد خدا سے یہ اقرار کرنا بھی مستحب ہے کہ بیوی کو رکھیں گے تو اچھی طرح ورنہ خوبی کے ساتھ رخصت کر دیں گے (یہ اقرار وضاحت کرتا ہے کہ شادی ایک ذمہ داری ہے رنگین مزاجی نہیں ہے)۔

(۴) نکاح کے صیغوں سے پہلے خطبہ نکاح کا پڑھا جانا۔

(۵) علی الاعلان ہونا۔ اور لوگوں کا گواہ ہونا اگر دائمی نکاح ہے۔ متعہ میں اعلان و گواہ مستحب نہیں ہیں۔

(۶) نکاح کا رات میں ہونا۔ مندرجہ بالا امور مستحب ہیں یعنی ان کا بجا لانا باعث اجر ہے۔ یہ رسمیں نہیں ہیں۔

سوگ سے متعلق بھی احکام شریعت موجود ہیں۔

عدہ وفات یعنی شوہر کے مرنے پر بیوہ کو ۴ مہینے دس دن کا عدہ رکھنا چاہیئے۔ عدہ کی مدت کے اندر بیوہ کے لئے واجب ہے کہ بدن یا لباس

یں زینت نہ کرے ۔ مثلاً سرمہ ۔ خوشبو ۔ خضاب ۔ سرخی نہ لگائے ۔ سرخ زرد اور ایسے رنگ کا لباس نہ استعمال کرے جو زینت سمجھے جائیں یاد رکھنا چاہئے کبھی سیاہ لباس بھی اس طرح کا ہوتا ہے کہ زینت شمار ہو جاتا ہے ۔ مختصر یہ کہ زینت نہ کرے نہ لباس یں نہ جسم میں نہ زیور پہنے ۔ لیکن نہانا دھونا صاف لباس پہنا ۔ ناخون کاٹنا وغیرہ جائز ہے کیونکہ یہ ضروریات زندگی میں زینت نہیں ہیں ۔ عدہ کی مدت میں بیوہ کو گھر سے باہر نہیں جانا چاہئے ۔

البتہ آقائے خوئی مدظلہ گھر سے باہر جانے کو مکروہ جانتے ہیں ۔ لیکن ضروری کام کے لئے یا ادا ء حق کے لئے یا کسی واجب کو ادا کرنے کے لئے یا کسی حاجت کو پورا کرنے کے لئے جانا جائز ہے ۔ (مندرجہ بالا مسائل عروۃ الوثقیٰ اور منہاج الصالحین سے لکھے گئے ہیں)

ان مسائل کے لکھنے کا مقصد یہی ہے کہ شریعت فطری تقاضوں کو پھلنے پھولنے کی بھرپور اجازت دیتی اس کے لئے ضرورت ہے مسائل جاننے کی اور رسموں کو بالکل چھوڑ دینے کی ۔

جو جوابی ظلم بھی نہ کرے وہ یوم مظلومین منائے

ہابیل وقابیل سے مظلوم وظالم کا سلسلہ نسل آدم میں شروع ہوا۔ جو آج تک جاری ہے۔ اس واقعہ سے قبل انسانوں میں نہ کوئی ظالم تھا نہ کوئی مظلوم۔ بلکہ سب ایک دوسرے کے چاہنے والے تھے کوئی باپ تھا اور کوئی بھائی۔ کوئی ماں تھی اور کوئی بہن۔ کوئی بیٹی تھی اور کوئی بیٹا۔ یہ عہد۔ عہد محبت تھا۔ عہد خلوص تھا۔ عہد سکون تھا۔ عہد راحت تھا۔ عہد نصرت تھا۔ عہد خبر گیری تھا۔ اس عہد میں کوئی بے چین ہی نہ تھا اور اگر کوئی بے چین تھا تو کسی کے لئے بے چین تھا۔ یہ بے چینی وہ تھی جس کو محبت جنم دیتی ہے اور خود یہ بے چینی ہمدردی۔ ایثار۔ خدمت کو جنم دیتی ہے۔

غرضکہ اس عہد میں کوئی کسی کے ہاتھوں بے چین نہ تھا لیکن آج وہ محبت ختم ہوگئی جو اس بے چینی کو جنم دیتی تھی جس بے چینی سے ایثار وخدمت کا جنم ہوتا ہے۔ محبت کیا ختم ہوئی۔ ہمدردی۔ ایثار۔ خدمت سب چیزیں ختم ہوگئیں جنم اور ختم میں آپ دیکھیں گے نقطے زیرو زبر ہوگئے ہیں۔ نقطوں میں اضافہ بھی ہوگیا۔ حرکت کو روک کر جزم میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ جس طرح ان تبدیلیوں سے جَنَم۔ خَتْم بن گیا ہے

اسی طرح آج محبت نفرت بن چکی ہے۔ ہمدردی خود غرضی میں تبدیل

ہو چکی ہے۔ ایثار کی جگہ بوالہوسی نے لے لی ہے۔ خدمت بیگار میں تبدیل ہو چکی ہے۔ سکون کی جگہ پر بے چینی کا راج ہے۔ آج کا انسان ظالم بھی ہے مظلوم بھی ہے۔ اور حیرتناک بات یہی ہے کہ جو مظلوم ہے وہ بھی ظالم ہے۔ صرف موقع اور قوت کی ضرورت ہے۔ آج مظلومیت کو بھی ظلم کی تلوار بنا لیا جاتا ہے۔ آج مظلومیت کو ڈھال بنا کر ظلم کی تلوار چلائی جاتی ہے۔ جو کیوبا کو مظلوم کہتا ہے وہ افغانستان میں کھلا ظالم دکھائی دیتا ہے۔ عرب اسرائیل کو ظالم کہتے ہیں اور مظلوم ایران پر یورش کرتے ہیں۔ امریکہ دو رُخ بنا ہوا ہے۔ خودکشی۔ قتل بلکہ قتل عام کا پاگل پن امریکہ میں رواج پا چکا ہے مگر امریکہ کو مظلوم پولینڈ کا غم کھائے جاتا ہے۔ ظلم نے زمین ڈھانپ لی ہے۔ زیر زمین بھی ظلم کی چکی چل رہی ہے ظلم سمندر میں بھی متلاطم ہے۔ ظلم کا ضیق النفس پیدا کرنے والا دھواں فضا پر محیط ہو چکا ہے۔ اور خلا میں داخلے کے راستے سوچ رہا ہے۔ اس دور ظلم کو مٹنا چاہیئے۔ اس تاریخ قابیل کو ختم ہونا چاہیئے اس رات کے بعد دن آنا چاہیئے۔ آنسوؤں کے بعد مسکراہٹوں کو۔ آہوں کے بعد قہقہوں کو آنا چاہیئے۔ جلی۔ جھلسی۔ سلگی دنیا کے بجائے۔ سرسبز و شاداب و شگفتہ دنیا کو آنا چاہیئے قابیل سے ظلم شروع ہوا ہے لہذا اس سے پہلے والا دور آدم آنا چاہیئے۔ صرف آنا چاہیئے نہیں بلکہ یقیناً آئے گا۔

جب قابیل سے قبل عہد عدل تھا تو دور قابیل کے خاتمہ پر پھر عہد عدل واپس آئے گا۔ ہر شے اصل کی طرف واپس ہوتی ہے۔ آدم جنت میں تھے۔ آخر میں آدمی کو جنت میں پہنچنا ہے۔

دنیا ظلم سے خالی تھی۔ تو دنیا کو پھر ظلم سے خالی ہونا ہے۔ یہ عقلی اور فطری تقاضہ بھی ہے اور تاریخی مشاہدہ بھی ہے اور قرآن و حدیث کا

بیان بھی ہے ۔نجات دہندہ عالم انسانیت حضرت مہدیؑ کے ظہور پر ظلم کا دن ختم ہو جائے گا اور مظلوم کا دن شروع ہو جائے گا ۔مظلوم انصاف پائیں گے ۔ اپنا حق پائیں گے ۔قلبی و روحانی و ذہنی و مادی سکون و راحت پائیں گے ۔ اور ظالم انصاف کا مزہ چکھیں گے ان کے ساتھ مکمل انصاف تو دوزخ کرے گا ۔ ظالم حق ادا کرنے پر مجبور ہوں گے ۔ اور قلبی و روحانی و ذہنی و مادی اذیت پائیں گے ۔

حضرت مہدیؑ مظلومین جہان کی حیات ہیں اور ظالمین عالم کے لئے موت ہیں ۔آپ کی تاریخ ولادت یقیناً یوم مظلومین ہے ۔ دنیا کے سارے مظلوم اس دن پیدا ہونے والی ہستی سے امیدیں وابستہ کئے ہیں ۔ اور ظالم اس کے ظہور کے تصور سے لرزہ براندام ہے ۔ظہور کا دن اور تاریخ و وقت علم خدا میں ہے ۔لیکن آنے والے کے قدموں کی جو آہٹ ایران کے اسلامی انقلاب میں محسوس ہوئی ہے اس کی وجہ سے تمام سپر پاور حواس عقلوں سے پیدل ہو گئی ہیں ۔

مظلوم اس دنیا میں بہت بار انقلاب لائے ہیں ۔آزادی ۔جمہوریت ۔سوشلزم ۔کمیونزم ۔ سماج واد ۔ ان ہی انقلابوں کے باقی رہ جانے والے وہ نشانات ہیں جن کو سیلاب انقلاب نے اپنے چھوڑا ہے ۔لیکن جس طرح شاندار عمارتیں کھنڈر ہو جاتی ہیں ۔ اسی طرح آج آزادی ۔جمہوریت سوشلزم ۔کمیونزم ۔سماج واد سب کھنڈر ہو چکے ہیں ۔ آزدی کے کھنڈر کا نام آوارگی ہے ۔جمہوریت کے کھنڈر کا نام اکثریت کی آمریت ہے ۔ سوشلزم کے کھنڈر کا نام چھین جھپٹ ہے ۔کمیونزم کے کھنڈر کا نام جبر و ظلم اور قتل و غارت ہے ۔ نسلی ازم کمیونزم کے کھنڈر کے زمین دوز حصہ کا نام ہے سماج واد اور فرقہ واریت ایک سانپ کے دو منہ ہیں ۔

اب قصاب مظلوم ہیں قصاب منصف ہیں۔ قصاب حیات آفرینی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ موت کا نام زندگی رکھا گیا۔ زندگی کا فرض ہے کہ ہنسی خوشی بے نام ونشان ہو جائے۔

مگر یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ آزادی آوارگی کیوں بنی جمہوریت امریت کیوں بنی۔ سوشلزم کا فریضہ سلب حقوق کیوں بنا کمیونزم کی ذمہ داری سلب حیات کیوں قرار پائی۔

جواب واضح ہے کہ مظلوم اکثریت واقتدار میں آکر ظالم بن جاتے ہیں اور اپنے مظلوم ماضی کی قیمت اپنے ظالمانہ مستقبل کو قرار دیتے ہیں جبکہ صحیح اور سچی بات صرف یہ ہے کہ ظلم کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے مظلوم کو بھی حق پانے کا حق ہے۔ حق چھیننے کا حق نہیں ہے۔

لیکن مزدور جب سرمایہ دار کے خلاف اٹھتے ہیں تو اس کے ان کمسن بچوں کو بھی ذبح کر دیتے ہیں جو ظالم کی اولاد ہو کر بھی ظالم نہ تھے۔ بلکہ مظلوموں کے ہاتھوں مظلوم ہو گئے۔ عقل۔ اخلاق۔ مذہب سب مظلوم کے ظلم کے بھی اتنے ہی مخالف ہیں جتنے ظالم کے ظلم کے۔ جناب ہابیل نے قابیل سے کہا تھا کہ میں تمھاری روش نہیں اپنا سکتا۔ تم قاتل بنو میں قتل ہو سکتا ہوں مگر قاتل نہ بنوں گا۔ تم ظلم کرو مگر میں جوابی ظلم کو بھی ناجائز مانتا ہوں۔ حضرت مہدیؑ کے ظہور کے بعد جہاں ہابیل کا عہد شروع ہو گا وہاں ہابیل کی روش بھی رائج ہو گی۔ مظلوم کو بھی حق ظلم نہ ہو گا۔ قاتل کو قتل کرنا قصاص ہے مگر قاتل کے متعلقین کو قتل کرنا جوابی ظلم ہے۔ مذہب قصاص کا حامی ہے جوابی ظلم کا مخالف ہے۔ صرف قتل ہی نہیں بلکہ زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات میں بھی وہ جوابی ظلم کا سخت مخالف ہے اور جوابی ظالم کے لئے بھی وہی دردناک

سزائیں ہیں جو ابتدائی ظالم کے لئے ہیں۔

۱۵ / شعبان ۲۵۶ھ کو حضرت مہدیؑ پیدا ہوئے آج دنیا کے ہر مظلوم کو آپ کی ولادت کے دن کو اپنا دن مان کر۔ اپنی نجات کا دن مان کر۔ اپنی امیدوں کا دن مان کر منانا چاہئے اور یوم مظلومین کی ترویج و اشاعت میں حصہ لینا چاہئے۔ نہ جاننے والوں کو اس دن کی حقیقت بتانا چاہئے۔ جاننے والوں کے دلوں میں انتظار و شوق کی آگ بھڑکانا چاہئے۔ اس دن کی اہمیت کی طرف پوری دنیا کو متوجہ کرنے کی کوشش میں اپنا حصہ ادا کرنا چاہئے مگر اس عہد کے ساتھ۔ اس قسم کے ساتھ اس مصمم عزم کے ساتھ کہ ظلم کا ساتھ ہرگز ہرگز نہ دیں گے۔ ظالم کو روکیں گے۔ نہ روک سکیں گے تو ٹوکیں گے۔ نہ ٹوک سکیں گے تو اس کے گرد بیزار حلقہ پیدا کریں گے تاکہ ایک دن اس کا حلقہ ظلم تنگ ہو جائے۔ اور خود بھی ظلم نہ کریں گے بلکہ اپنی فکر و عمل کا برابر جائزہ لیتے رہیں گے کہ گھر سے لے کر بین الاقوامی سطح تک ہم معمولی سے معمولی جوابی ظلم کے بھی مرتکب نہ ہونے پائیں۔ ظلم کرنے والے کو۔ ظلم پر خاموش رہنے والے کو اور جوابی ظلم کرنے والے کو یوم مظلومین منانے کا حق نہیں۔ رب کریم ہماری التجا قبول کر اور ہم کو یوم مظلومین منانے کی فکری و کرداری توفیق عطا فرما۔

دامن کی خبر ہے نہ گریباں کی خبر

جوانی دیوانی مشہور رہی ہے جوان نشۂ شباب میں چور یونہی کب ہوش کے کان آنکھ رکھتا ہے اس پر طرہ آج کا روشن دور بدلتا زمانہ بدلتے حالات ہیں جس سے نئی نسل گذر رہی ہے نوجوان وجوان طبقہ کو الجھن پیدا ہے سب حیران و پریشان ہیں دور کہن کے طریقے من بھاتے نہیں نئے تقاضے نئے مسائل کیا کھائیں پئیں کیسے رہیں سہیں کیا پہنیں اوڑھیں کیا پڑھیں کیا لکھیں۔ کس سوسائٹی اور کس صحبت میں اٹھیں بیٹھیں اپنے لئے فیصلہ نہ کرسکنے کی صورت میں جوان خود کو مختلف ڈھنگ سے پیش کرتا ہے جسم و لباس کی مختلف انداز سے نمایش ہوتی ہے کبھی دیکھئے تو لباس ڈھیلا ڈھالا لانبا چوڑا پہنے ہے تو کبھی تنگ چست زیب تن کئے ہے کل بناؤ سنگار کا انداز کچھ تھا آج کچھ ہے تال میل ہی درست نہیں ہوتا دوسروں کی پسند حاصل نہیں ہوتی اور خود تمیزی مفقود ہے کھانا چھی چھی پینا چھی چھی گھر کی رفتار پرانی ہر شے میں زہر و جراثیم کیا کھائے کیا پیئے برتن غذا ایندھن سب پاک صاف چاہیئے ٹیبل کرسی چھری کانٹے یہ کھانے کے وقت کی باتیں ہیں۔

تعلیم کے سلسلہ میں پریشانی لاحق ہے کبھی یہ خیال کہ پڑھنا لکھنا سب بیکار ہے کام سیکھو کاریگر بنو جلد کماؤ پونجی پتی بن جاؤ کبھی یہ خیال کہ نہ کچھ پڑھو لکھو نہ کچھ سیکھو تجارت کرو اور ملک التجار بن جاؤ اور اگر پڑھنے ہی کا معاملہ ٹھہرا

توسوال پیدا ہوا کہ کس شعبہ علم کو اختیار کریں ادیب بنیں کہ فلسفی ڈاکٹر ہوں کہ وکیل اسکول کالج یونیورسٹی میں پہنچے عقل کو دوسری باتوں میں صرف کرنا شروع کیا انتظام جو پڑھنے والے کا کام نہیں اس میں دخل پڑھنے والے ساتھی سیکھنے پڑھنے میں مشغول رہے اور زاید عقل رکھنے والا جوان اصلاحات میں پڑے گا یہ کالج نہیں اچھا تو اس کے منتظمین خراب ہیں تو اس کے اساتذہ جاہل ہیں احتجاج حد سے بڑھا آخر لیڈر نکالے گئے ناقص کے ناقص رہ گئے رہی صحبت و سوسائٹی کی بات تو جیسے دیگر معاملات میں اب تک خود رائی برتی خود ہی اچھی بری صحبت بھی اختیار کی ترقی پسندوں مادہ پرستوں میں رہے کامریڈ بنے ناستک کہلائے پڑھنے لکھنے میں لگے دانشور ہوئے جرنلسٹ بنے اور پست و ذلیل سوسائٹی میں رہے جواری شرابی چور ڈاکو قاتل شمار ہوئے۔

بچپن کی چھوٹ کا نتیجہ۔ روحانی تربیت کے نہ حاصل ہونے کی بنا پر دین سے بے خبری۔ پھر بیزاری نے آج جاہل اور پڑھے لکھے دونوں کو بے راہ روی اور بے لگام زندگی گذارنے میں ایک صف میں کھڑا کر دیا ہے وہی خلاق سوز حرکتیں جو بربنائے جہالت جاہل جوان طبقہ میں ہیں وہی پڑھے لکھے طبقہ میں پائی جاتی ہیں فرق صرف یہ ہے کہ جاہل جو کام سادگی سے کر گذرتے ہیں پڑھے لکھے وہی ترقی زدہ رنگ آمیزی سے انجام دیتے ہیں کھیل تماشوں اور بری عادتوں کا اگر جائزہ لیں تو دونوں طبقوں کا ایک روپ دکھائی دے گا مٹی کے کوزہ اور بلوری جام دونوں میں شراب ہے جاہل شراب کی بھٹی میں جا کر ہے اور پڑھا لکھا سیوت کلب میں ہوٹل میں پیتا ہے جاہل سڑک پر نالیوں میں لوٹتا بیہوش پڑا دکھائی دیتا ہے اور پڑھا لکھا طبقہ کلب سے گھر ننگا پہنچتا ہے۔ جاہل جواری چھپے پوشیدہ ٹھکانوں پر جوا کھیلتے ہیں اور پڑھے لکھے

کلب میں ہوٹل میں کھلے خزانے جوا کھیلتے بازی لگاتے ہیں ناچ رنگ کا جاہلوں میں شوق اور اس سے بڑھ کر پڑھے لکھوں میں جو کیبرے ڈانس اور ننگا ناچ دیکھتے ہیں اور کلب میں جاہلوں سے بڑھ کر اپنے ناموس کو دوسرے کے پہلو میں دنیا تک پسند کرتے ہیں آج اونچی سے اونچی تہذیب میں لڑکے لڑکی زن و مرد میں صنفی دوئی۔ پیدائشی امتیاز۔ افتاد مزاج کو یوں نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ شیر و بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے ہیں نہ عورت کے لئے کوئی مرد اجنبی ہے کہ مرد کے لئے کوئی عورت غیر ہے پارسائی و عفت کا ہر ایک کے پاس لباس ہے کہ کبھی کسی سے غلطی کا امکان نہیں۔ کچھ باتوں کی عام چھوٹ ہے جیسے تفریح کے لئے اجنبی نوجوان کے ساتھ دوستانہ میں دوشیزہ کا گھر کے باہر جانا رومانی ناولوں ڈائجسٹوں کو پڑھ کر ہر روز ذہنی تھکن اور بے چینی میں اضافہ کرنا۔ پردۂ سیمیں پر میل ملاپ کے منظر سب کے پیش نظر ہیں نامناسب خواہشات کے مہمیز کئے جانے پر اور جنسی احساس کے بیدار کرنے والی صورتوں کے اختیار کرنے کے بعد پارسائی کا تصور تہذیب نو کا وہ کارنامہ ہے جس کا خواب دیکھنا ممکن ہے عملی وجود کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔

جاہلوں میں چوری ڈکیتی مار پیٹ قتل و غارت اغوا وغیرہ جیسے برے کام انجام پاتے ہیں پڑھے لکھوں میں بڑے پیمانہ پر یہی کام انجام دئے جاتے ہیں بڑے بڑے بنکوں میں دن دھاڑے ہتھیار بند پستول و بندوق آتشیں اسلحوں سے لیس پڑھا لکھا گروہ ڈاکہ ڈالتا ہے کیمیاوی جوہری ہتھیار سے کام لیا جاتا ہے جہاز اغوا ہوتے ہیں آدمی غائب کئے جاتے ہیں پانی میں تارپیڈو سے کشتیوں کو تباہ کیا جاتا ہے سیاسی قتل انجام دئے جاتے ہیں اور ہیروشیما ناگاساکی کو ایٹم بموں سے اڑایا جاتا ہے ظاہر ہے اس دور میں

پلنے والے بچے نئی نسل جن کے کاندھوں پر کل قوم ملت کی ذمہ داری کا بوجھ آنے والا ہے اگر ان کی ذہنی روحانی دینی تربیت سے یونہی لاپرواہی برتی گئی تو پھر انسان کا بیڑہ غرق ہے۔

اس بارے میں سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے اور بگاڑنے سدھارنے والی دونوں باتوں کا گہرا جائزہ ضروری ہے وہ اسباب کیا ہیں جن سے دینی اخلاقی انحطاط پیدا ہے اور وہ عوامل کیا ہو سکتے ہیں جن سے صحت مند معاشرہ وجود میں آسکتا ہے بہرحال پاک صحیح انسانی تہذیب کی واپسی ہی پر خوشگوار زندگی موقوف ہے اسی سے دنیا و آخرت کی خوشیاں نصیب ہوں گی ناپختہ ذہنوں کو جوانوں کو مطمئن کرنا ان کی الجھن کو دور کرنا۔ ان کی روش کو درست کرنا اولین فرض ہے اس سلسلہ میں چند باتیں پیش کی جاتی ہے جس میں خرابی اور خرابی کا علاج دونوں ہی باتوں کا ذکر ہے۔

(۱) **نئی پرانی زندگی کا ٹکراؤ** پرانی تہذیب پرانے طرز و طریقے جو ماں باپ سے ملے اپنے فایدوں سمیت زندگی سے وابستہ رہ کر حیات کا جزبن چکے ادھر نئے نرالے آداب زندگی باہر سے بدلتے زمانہ کی عنایت جن میں نئے پن کی کشش کے سوا مفید تر ہونے کی کوئی بات نہیں جوان پر ارمان کشمکش میں مبتلا ہے کیسے پچھلے طریقہ کو چھوڑے اور نئے ڈھنگ کو اپنائے اگر پچھلے طرز پر باقی رہتا ہے تو رجعت پسند کہلاتا ہے اور نئے طرز کو اختیار کرتا ہے تو گھر میں ٹکراؤ ہوتا ہے۔ اس موقع پر ماں باپ اور نوجوان دونوں اگر سمجھ سے کام لیں تو یہ الجھن دور ہو جائے۔ جوان کو یہ سمجھنا چاہیے کہ ماں باپ کا یہ زمانہ نہ تھا انھوں نے دوسرے اصول سے پرورش

پائی تھی ان کا رہن سہن اپنے اعتبار سے ٹھیک ہے لہٰذا گھر میں دو عملی سے گریز بہتر ہے۔ اور ماں باپ کو یہ ضد نہ ہونا چاہئے کہ نوجوان اولاد انھیں کی طرح زندگی بسر کرے اور نام کو بھی انحراف پیدا نہ ہو لباس وضع قطع چال ڈھال عادتیں اخلاق سب اپنے جیسے ہوں پوچھئے تغیر احوال سے جب انسان آج اس منزل ترقی پر پہنچا ہے تو اگر حالات نہ بدلیں گے تو پھر سطح زندگی اُونچی ہو کر کمال کی منزل تک کیسے پہنچے گی حالات بدلنے پر جوان پر جا سختی تو درست بے جا سختی مناسب نہیں اگر یوں سمجھداری سے ایک دوسرے نے کام نہ کیا تو کشمکش لازم ہے پرانے ڈھانچے کے بدلنے اور زمانہ کے تقاضوں کے پورا کرنے میں فساد لازم ہے زندگی کا منظم شیرازہ پراگندہ ہوگا اور نتیجہ میں بدحالی ہاتھ لگے گی۔

(۲) آیندہ پر نظر خوش آیند زندگی کی تلاش جوان ہی کو نہیں ہر شخص کو ہے جوان سب سے زیادہ اپنے مستقبل کے بارے میں فکرمند ہوتا ہے پڑھنے والا نوجوان یہ نہیں جانتا کہ پڑھنے کے بعد وہ امیدیں جس کے لئے سارے پاپڑ بیلے ہیں پوری بھی ہوں گی یا نہیں خرچ نے ماں باپ کی کمر توڑ کر رکھدی وقت صرف ہوا محنت انجام دی دماغ لگایا کہ مراد پوری ہو۔ جوان کی آیندہ کی فکرمندی حق بجانب ہے ملک کو قوم کو یقیناً ایسی آسانیاں پیدا کرنا چاہئے جو نوجوان کو مطمئن کریں خوشحال فرد سے، خوش حال گھر اور خوش حال گھروں سے خوش حال قوم پیدا ہوتی ہے۔

(۳) تعلیم کا طریقہ جوانوں کے انحراف کا سبب رائج طریقہ تعلیم ہے کہ بچے ادھر رینگنا شروع ہوئے بغیر روح کو جگائے دینی اصول

بتائے انگلی پکڑ کر سیدھے اسکول پہنچا دے کے چاہے کہیں پہنچ

یہی ہے اب وہ چاہے بنیں یا بگڑیں ماں باپ کو کوئی اس سے

مطلب وغرض نہیں کتابیں کاپیاں خرید دیں اسکولی ڈریس بنوادیا

فیس ادا کردی سال میں جو چندہ کی رقم ہوئی دیدی باقی فرصت

تعلیمی نتیجہ بہتر رہا سند اور ڈگری مل گئی مربی خوش ہوگئے کہ مراد

پوری ہوئی جبکہ اس سند یافتہ کو مروجہ علم تو حاصل ہوا مگر دینی اخلاقی

روحانی تعلیم اور عملی تہذیب سے محروم رہا۔ بھلا اس اکہرے علم کے حاصل

ہونے سے کیا فائدہ جو اخلاق سے عاری ہو وہ فکر کس کام کی جو سلجھی

طبیعت عمدہ خصلت کے ماتحت نہ ہو بقول افلاطون محض تعلیم دینا

نصیحت کرنا عبرت کے واقعات بیان کرنا بچوں کے لئے کافی نہیں اس سے

پہلے حسب طبیعت اصول دین صفحہ قلب پر نقش کرنا ازبس ضروری ہے

بچوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینا صحیح نہیں ان کی فہمایش ضروری ہے

ایسی باتوں سے روکنے کی ضرورت ہے جو سادہ وپاکیزہ طبیعت کو گندہ

اور خراب کرتے ہیں۔

ناقابل برداشت مگر سچ

عیبوں پر پردہ ڈالنے والے خدا کی سب سے بڑی مہربانی ہے کہ انسانوں کو ایک دوسرے کے پوشیدہ گناہ۔ پوشیدہ خیالات۔ پوشیدہ تمناؤں سے بے خبر رکھتا ہے ورنہ ہر انسان اپنے کالے کرتوت۔ کالے بھید اور نظر کی چوریوں کے باعث ایسا ننگا ہو جاتا کہ کوئی کسی کا سامنا کرنے کی ہمت نہ کرتا اور نہ کوئی کسی کو اپنے پاس پھٹکنے دیتا۔ لڑکی حیران ہو جاتی کہ ماں نے کیا کیا کیا ہے اور کیا کیا۔ سوچا ہے۔ لڑکے حیرت زدہ رہ جاتے کہ باپ کی پوشیدہ زندگی کے پیش نظر باپ کو باپ مانیں یا نہ مانیں اور نہ مانیں تو کیسے نہ مانیں اور مانیں تو دل کو کیسے سمجھائیں کہ ہمارے باپ ایسے ہیں۔ اس طرح شوہر بیوی۔ استاد شاگرد نام نہاد علماء اور ان کے معتقدین سب ہی ایک دوسرے سے ناقابل تصور نفرت کرتے۔ سب کپڑے پھاڑ کر جنگلوں کو نکل جاتے اور وہاں بھی ایک دوسرے کو دیکھ کر کہیں پناہ نہ پاتے۔ آج اگر ہم گھروں میں ہیں اور گھر والے خاندان والے۔ پاس پڑوس والے۔ جاننے والے اور پہچاننے والے ہماری عزت کر رہے ہیں۔ تو صرف اس لئے کہ اس ستار العیوب خدا نے ہمارے پوشید گناہوں پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ لیکن ہر شخص اپنے اعمال کے نگراں اور گواہ خدا۔ نبیؐ اور امامؑ کے سامنے بے نقاب ہے۔ ان سے کچھ پوشیدہ

نہیں اور ہم بے شرمی کی اس حد پر ہیں کہ بچہ دیکھ لے گا اس کا خیال تو ہمیں برابر آتا رہتا ہے لیکن ہمارے اعمال کے نگراں خدا نبیؐ و امامؑ کی نگاہوں کا ہمیں کوئی لحاظ نہیں ہے۔ بلکہ اس قرآنی بیان پر ہمارا ایمان نہیں ہے کہ یہ حضرات ہمارے اعمال کے نگراں ہیں حالانکہ اگر کسی کو عین حالت جرم میں بھی کسی طرح یہ خیال آگیا کہ خدا دیکھ رہا ہے تو پھر اس سے گناہ نہیں ہو سکتا۔ معصومؑ کے معصوم ہونے کا راز بھی یہی ہے کہ وہ اپنے کو ہر وقت خدا کے سامنے حاضر پاتے ہیں لہذا امکان گناہ ان کے لئے نہیں ہے وہ مجبور نہیں ہوتے ہیں بلکہ اپنے اختیار پر اپنے ارادہ کے ذریعہ خدا کی مشیت کے مطابق جبر کرتے ہیں اس جبر میں ساری زندگی کامیاب رہتے ہیں معصومؑ تو معصومؑ ہیں مگر جن غیر معصوم افراد نے اپنے اوپر نگرانی خدا و نبیؐ و امامؑ کے تصور کو طاری کر لیا۔ پھر ان سے بھی کبھی گناہ سرزد نہ ہوا۔ معصوم نہ تھے۔ ان کو عصمت کی سند خدا نے نہ دی تھی۔ ان کے کردار کی تکمیل صحت کی ذمہ داری خدا نے نہ لی تھی۔ لیکن انھوں نے اپنے کو اتنا بچایا کہ ان کا شمار ان لوگوں میں ہو گیا جو محفوظ تھے۔ معصوم معصوم ہے۔ محفوظ محفوظ ہے مگر ہم اپنے اوپر پابندی عائد کرنا نہیں چاہتے بلکہ ہماری خواہش ہے کہ ہماری بحث سے الٰہی فیصلہ تبدیل ہو جائے۔ ہم دین کے لئے تبدیل نہ ہوں بلکہ دین ہمارے گناہگار چشم و ابرو کے مطابق تبدیل ہوتا رہے۔ اگرچہ یہ مجنونانہ خیال محال ہے مگر ہم محال کو ممکن بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔

اگر کوئی ہم کو جھوٹا۔ غدار، چور۔ ڈاکو۔ بدکار۔ لفنگا۔ غنڈہ۔ شہدہ کہہ دے تو یہ الفاظ ہمارے لئے ناقابل برداشت ہوں گے لیکن اگر ہم اپنی پوشیدہ زندگی کی خود جانچ کریں گے تو یہ سب باتیں سچ نکلیں گی۔ بلکہ سچائیاں

ایسی گھناؤنی اور مکروہ ہوں گی کہ یہ الفاظ ان کی نشاندہی کرنے میں کمزور اور ناکافی ثابت ہوں گے۔ کیا ہمارا سب سے بڑا جھوٹ ایمان نہیں ہے؟ ہم خدا۔ نبیؐ۔ امامؑ پر ایمان لائے ہیں کہ وہ جو کچھ کہیں گے ہم مانیں گے جو حکم دیں گے ہم مانیں گے۔ وہ جسے حق کہیں گے ہم اس کا اعلان کریں گے کیونکہ ایمان دل کے یقین۔ زبان کے اقرار اور اعضاء سے عمل کا نام ہے لیکن جب مذہب کے خلاف سوچتے ہیں۔ مذہب کے خلاف بولتے ہیں۔ مذہب کے خلاف کرتے ہیں تو کیا ہمارا ایمان درحقیقت بمنزلہ جھوٹ نہیں ہے؟ ہم جب خود کو مذہبی نہیں بناتے۔ اپنے گھر کو مذہبی نہیں بناتے۔ اپنے معاشرہ کو مذہبی نہیں بناتے ________

________ بلکہ مذہبیت اور دین کی پابندی کو دیکھ کر چڑھ جاتے ہیں اور مذہبی بنانے کی کوشش کرنے والے پر چڑھ دوڑتے ہیں تو ہم اپنے مذہب کے بھی غدّار ہیں اور اپنے گھر۔ خاندان اور معاشرہ کے بھی غدار ہیں کہ ان کو دوزخ سے بچانے کے بجائے دوزخ میں جھونک رہے ہیں ہم جب زکوٰۃ، فطرہ۔ خمس۔ کفارہ نہیں ادا کرتے ہیں تو نہ صرف مال خدا کی چوری کرتے ہیں بلکہ نبیؐ و امامؑ کے مال کے بھی چور ہیں اور یتیم، غریب، مسافر، مسجد، مدرسہ، دین، دینی تعلیم، دینی ضرورتیں سب کا مال چراتے ہیں۔ اور جب کسی وقف یا ادارہ اور انجمن کا مال کھاتے ہیں تو پھر کھلے ڈاکو بن جاتے ہیں۔ ہم چاہے سماج کی بے عزتی کے خوف سے بدکاری نہ کر سکیں مگر ہمارا ذہن کتنا بدکار ہے اس کا اندازہ ہمارے علاوہ کسی دوسرے کو نہیں ہو سکتا ہم اپنے اندر کی فحاشی کو دبائے رکھتے ہیں کہ گالیاں بکیں گے۔ نازیبا باتیں

اور بیہودہ کام کریں گے تو لفنگے کہلائیں گے لیکن ادھر ہم کو خوشی کا بہانہ ملا۔ شادی بارات۔ چوتھی۔ چالہ ہوا اور ہمارا لفنگاپن کھل گیا۔ بلکہ بعض علاقوں میں مذہبی خوشی کے نام پر ہونے والے نازیبا حرکات کو بھی کارِ ثواب سمجھا دیا گیا ہے۔ اور جاہل تو جاہل اسے جو چاہو سمجھا لو۔ ہم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہمارے کردار میں غنڈہ گردی اور شہدہ پنا۔ داخل ہو سکتا ہے لیکن جب اور جہاں ہمیں اپنی مجاریٹی اور اکثریت کا احساس ہو جاتا ہے وہاں ہم انفرادی اور اجتماعی طور پر غنڈہ گردی اور شہدہ پن پر اتر آتے ہیں۔ اس وقت ہم کو نہ انسانی شرافت کا خیال رہ جاتا ہے نہ مذہبی تقدس کا احساس باقی رہتا ہے۔ کینچل گر جاتی ہے اور زہریلا ناگ پھن کاڑھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ میں نے جن سچائیوں کو پیش کیا ہے وہ لاکھ سچائیاں ہوں مگر بہر حال ناقابل برداشت ہیں میرے قلم سے نکلے الفاظ غصہ بھی دلائیں گے اور میرے خلاف نفرت بھی پیدا کریں گے مگر سچائی بہر حال سچائی ہے جو اہل حق کے علاوہ سب کو کڑوی محسوس ہوتی ہے۔ مگر ایسا کیوں ہے۔ ہمارے خیالات وعادات میں مذہب کی اتنی دوری اور مخالفت کیوں ہے۔ اس کی صرف ایک وجہ ہے کہ ہم جعفری ہیں مگر فقہ جعفری کو ہم اپنی زندگی میں نافذ نہیں کرنا چاہتے۔ اپنے انداز فکر پر اپنے خواہشات پر اپنے سماج پر ہم شریعت کی برتری و بالاتری کو عملاً تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ مخالفت شریعت کے باوجود ہم چور دروازوں سے جنّت میں گھس جانا چاہتے ہیں۔ مگر بدترین حماقت ہے اپنے کو دھوکہ دینا اور بدترین برائی ہے دوسروں کو دھوکہ دینا اگر ہر سماج میں اخلاق کے ضوابط بالاتر ہیں۔ اگر ہر ملک میں عدالت اور قانون بالاتر ہیں تو اسلام میں شریعت ہر طرح بالاتر ہے کسی جبشی و

قریشی کو چھوٹ نہیں ہے ۔ ہم کو حیرت ہوتی ہے کہ ہندستان میں ہم مسلم پرسنل لا
کے نفاذ کا مطالبہ کرتے ہیں ۔ پاکستان میں فقہ جعفری کے نفاذ کا مطالبہ کرتے
ہیں اور اسلامی قوانین و فقہ جعفری کے زندگی میں عملی نفاذ کے سب سے
سخت ۔ سب سے بدتر مخالف ہم ہیں میری یہ بات ناقابل برداشت ہے
مگر سچی ہے ۔ ہماری ساری ڈینگ اسی لیے ہے کہ روز حساب قیامت
کے بعد ہے ۔ قیامت سے پہلے ستار خدا نے ہمارے عیب چھپا دیئے ہیں
مگر آخرت کی رسوائی جو شدید ترین رسوائی ہوگی اس سے پہلے دنیاوی
رسوائی کا سامنا بھی ہوسکتا ہے ۔ عہد حکومت حضرت امیر المومنین علی
علیہ السلام میں ایک نہایت حسین ۔ شکیل ۔ خوبصورت جوان چوری کے
الزام میں گرفتار ہوا ۔ حضرتؑ نے اُسے دیکھ کر فرمایا خدا نے تجھے جتنی اچھی
صورت دی تھی تو نے کاش اتنی ہی اچھی سیرت بھی بنائی ہوتی تو صورت
کی نعمت کا شکر بھی ادا ہو جاتا اس نے کہا کہ مجھ پر تیرہ آدمیوں کے خرچ کا
بوجھ ہے ۔ جن کی فاقہ کشی نے مجھے پہلی مرتبہ جرم پر مجبور کیا ۔ حضرت نے فرمایا
تو خدا پر اتہام و الزام لگاتا ہے ۔ اگر تیرا یہ جرم پہلا ہوتا تو خدا اسے چھپا دیتا ۔
تو نے اس جرم کو اتنی بار کیا ہے کہ مہربان خدا نے تیرا پردہ فاش کر دیا ہے
حقیقت ظاہر ہونے پر اس نے اقرار کیا کہ ۹۹ چوریاں کر چکا ہوں یہ سوویں
چوری تھی ۔ لوگ حضرت کی دست بوسی کو ٹوٹ پڑے کہ آپ کے پاس حقائق
کا کیسا بحر ذخار ہے ۔ چور کو سزا دی گئی تاکہ شریعت کی برتری ماننے والوں
کے سامنے آجائے ۔

ہم میں سے کوئی بھی دنیاوی رسوائی برداشت کرنے کی طاقت
نہیں رکھتا ۔ ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ جب رسوائی کا دھڑ کا

پیدا ہوتا ہے ہماری آواز بے قابو ہو جاتی ہے۔ زبان پر لکنت کا قبضہ ہو جاتا ہے جب ہم رنگے ہاتھوں پکڑ لئے جاتے ہیں تو آخرت کی رسوائی اور عذاب کی کس میں ہمت ہو سکتی ہے لہٰذا لازم ہے کہ ہم اپنی برائیوں کا علاج شریعت کی بالاتری سے کریں۔ اپنی بے جا گمراہ کن۔ خدا و معصومینؑ کو غضبناک کرنے والی بحثیں بند کر دیں اور اپنے کو فقیہ کے فتویٰ کے حوالہ کر دیں جو حکم امام عجؑ ہے۔ ورنہ نامہ عمل لکھنے والے ملائکہ اسی ناقابل برداشت سچائی کو ہمارے نامہ عمل کی سرخی بنائیں گے۔

”دین جعفری کو مانتا تھا اور فقہ جعفری کا مخالف اور دشمن تھا“

لہٰذا اے خدا اس کا فیصلہ کر۔ الٰہی فیصلہ ہوگا۔ ضرور ہوگا مگر ہمارا حال کیا ہوگا؟

ہماری خرابیوں کا علاج

ہماری دینی اور قومی زندگی شدید انتشار کا شکار ہے۔ ہر طرف خرابیاں ڈیرہ ڈالے ہیں۔ برائیوں نے اڈے جمالئے ہیں۔ افراد۔ علما۔ مصلحی اصلاح سے مایوس ہو گئے ہیں بلکہ مایوسی کا اعلان کر کے صورت حال کو مزید بگڑنے کا موقع دے رہے ہیں۔ اگرچہ انفرادی کردار بد اخلاقیوں میں گرفتار ہے اور اجتماعی کردار ہر گراوٹ کا حامل ہے۔ لیکن اس کے باوجود اصلاح سے مایوس ہو جانا نہ صحیح ہے نہ مناسب ہے۔ اصلاح ممکن ہے اور کامیابی یقینی ہے بشرطیکہ صحیح علاج تلاش کیا جائے اور اس پر عمل کرنے کی ہر تدبیر کو بروئے کار لایا جائے۔ جس دین کے ذریعہ کل جاہلیت عرب کا علاج ہوا تھا۔ جس دین کے ذریعہ آج جاہلیت عجم کا علاج ہوا ہے۔ اسی دین کے ذریعہ ہماری "جاہلیت" کا علاج بھی ممکن ہے صرف جاہلیت عرب کے علاج کی نظیر شاید ہمت افزائی کا ذریعہ نہ بنتی۔ بلکہ یہ تصور مایوسی کا سہارا بن جاتا کہ جاہلیت عرب کا علاج صرف دین کے نسخہ شفا سے نہیں ہوا بلکہ حضورؐ جیسا طبیب شافی بھی موجود تھا۔ لیکن آج جاہلیت عجم کا علاج آقائے خمینی کے ذریعہ ہوا ہے جو نہ معصوم ہیں نہ نبی ہیں نہ امام ہیں۔ صرف عالم دین ہیں۔

ایرانی اسلامی انقلاب اس بات کی یقین دہانی کراتا ہے کہ دین کے ذریعہ کامیاب علاج کیا جا سکتا ہے البتہ ضرورت ہے لگن سے کام کرنے کی۔

ضرورت ہے اللہ پر بھروسہ رکھنے کی ضرورت ہے ناکامی کے ہر خیال کو ذہن سے جھٹک دینے کی ۔ضرورت ہے قربانیاں دینے کی ۔ضرورت ہے کہ کام کی ابتدا افراد کی دینی تربیت سے کی جائے ۔ افراد سے قوم کی تعمیر ہوتی ہے ۔ اگر افراد دیندار بن گئے تو سماج دیندار بن جائے گا سماج کے دیندار ہو جانے کے بعد ہر خرابی کا علاج ہو جائے گا ۔ خرابیوں کا سبب تھوڑے سے آدمی ہوئے ہیں جس کالج میں اسٹرک ہوتی ہے یا جس کارخانہ میں ہڑتال ہوتی ہے یا جس شہر میں صنعتی یا طبقاتی یا مذہبی فساد ہوتے ہیں جو انسانوں کو خون میں نہلاتے ہیں ۔ ملکیتوں کو خاکستر بناتے ہیں ۔لیکن جب کبھی ایسا ہوتا ہے تو اکثریت یہ کام نہیں کرتی ہے بلکہ مٹھی بھر افراد سارے ہنگاموں کا سبب بنتے ہیں اور اکثریت خاموش رہنے میں نجات سمجھتی ہے ۔

آپ کسی اسکول، کالج، یونیورسٹی کا جائزہ لیں سو میں دس لڑکے نوے لڑکوں پر حکومت کرتے دکھائی دیں گے ۔کسی فیکٹری ۔ کارخانہ کا جائزہ لیں مزدوروں کی اکثریت پیٹ کی آگ بجھانے کیلئے ۔اور ننگے بھوکے بچّوں کے آنسو پونچھنے کے لئے کام کرنے پر تیار ملے گی لیکن چند نیتاؤں کے ہاتھوں بے بس رہے گی ۔ فسادات میں آبادی کی اکثریت ۔ زحمت ۔ تکلیف ۔نقصان ۔خوف دہشت کا شکار بنتی ہے لہٰذا وہ امن چاہتی ہے مگر چند سرکش گنڈوں کا راج رہتا ہے ۔حکومت ۔ پولیس ۔ عدالت سب اس خونی کھیل کو بار بار کھیلتے دیکھتی ہیں مگر یا خاموش تماشائی رہتی ہیں ۔ یا خود بھی شریک ظلم ہو جاتی ہیں یا انصاف کو قانون کے ہاتھوں میں قیدی بتا کر اپنے کو ذمہ داریوں سے آزاد کرا لیتی ہیں ۔

اگرچہ آزادی ہند کے ۴۳ سال سے یہ سب ہو رہا ہے ۔لیکن اس

دوران میں چند ایسے واقعات بھی دیکھنے میں آئے جو اندھیرے میں بہت دور کی روشنی ہونے کے باوجود بھٹکے مسافر کو منزل کی طرف قدم بڑھانے کی ہمت دلاتے ہیں۔ دور کی روشنی بھی بہت بڑا سہارا ہوتی ہے۔ مسافر سوچتا ہے کہ اپنا گھر نہ سہی کسی کا گھر تو ملے گا۔ منزل نہ ملے گی تو دم لینے کا موقع تو ملے گا۔ ہماری خوفزدہ سانس تو قابو میں آجائے گی۔ دور کی روشنی کے سہارے مسافر ہمت نہیں ہارتا ہے بلکہ نئی ہمت۔ نئی تلاش۔ نئے منصوبہ کے ساتھ سرگرم سفر ہو جاتا ہے۔ غرضکہ ایک ایسا ہی واقعہ سنئے۔

شمالی ہند کا صوبہ بہار ہمیشہ سے غیر قانونی آزادی کے لئے مشہور رہا ہے۔ جب ٹرین صوبہ بہار میں داخل ہوتی ہے تو مسافر ہر کوچ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ قانون غائب ہو جاتا ہے۔ بس مسافر ہی مسافر دکھائی دیتے ہیں۔ مسافروں میں بھی کچھ کچلنے والے ہوتے ہیں۔ اور کچھ کچلا جانا اپنا مقدر سمجھتے ہیں۔

لیکن اسی بہار میں ہم آرہ سے سوار ہوئے ایک پولیس افسر نے دو دیہاتیوں کو گالیاں دے کر دانا پور میں ریزرویشن کے باوجود ڈبہ سے نکال باہر کیا تھا۔ سارا ڈبہ خاموش تماشائی بنا رہا۔ صرف ایک مسافر نے اس خلاف قانون حرکت پر ٹوکا۔ جب گاڑی آرہ سے چلی تو اسے بکسر ٹھہرنا تھا اور پولیس افسر بکسر اسٹیشن پر ریلوے پولیس کا سربراہ تھا لہٰذا گاڑی چلتے ہی پولیس افسر بھی چلا۔ اور خلاف قانون حرکت پر جس مسافر نے ٹوکا تھا اس کی خبر لینا شروع کی۔ ٹوکنے والا ایک ڈاڑھی والا مسلمان تھا۔ پولیس افسر نے بطور سزا ڈاڑھی پکڑ کر جھٹکے دینے شروع کئے۔ ڈبہ اب بھی خاموش تھا کہ ایک بار اوپر کی برتھ پر سے ایک سردار جی اپنے بڑھاپے کے باوجود گرجے کہ تم نے

مولوی صاحب کی ڈاڑھی کیوں پکڑی سردار جی کی کڑک نے پورے ڈبہ میں اخلاقی جرأت پیدا کردی۔ تھوڑی دیر میں پولیس افسر۔ڈاڑھی والے کے ہاتھوں بڑی طرح مار کھا چکے تھے۔مسافر اُن کو پولیس کے حوالے کرنے کے لئے مغل سرائے لے جانے پر مصر تھے۔گاڑی بکسر یعنی پولیس افسر کے ہیڈ کوارٹر بلکہ پایہ تخت پر کھڑی تھی۔کنڈکٹر اور اسٹیشن کی پولیس کے جوان اپنے افسر سے معافی منگوا کر ان کو رہائی دلوا رہے تھے۔اپنے ماتحتوں کے سامنے رسوائی منھ پر پوت کر پولیس افسر اتر گئے۔مسافروں کا غصہ بھی اتر گیا گاڑی چل پڑی اور میرے ذہنی خیالات کے سلسلے چل پڑے۔کہ اگر اسی طرح ایک ایک آدمی کا ضمیر جاگ اٹھے تو پورے سماج کو جاگنے میں دیر نہیں لگے گی اور جب سماج جاگ جائے تو خرابیوں کو ابدی نیند سو جانا ہی پڑے گا۔

آج اگر ہم ہر طرح رو بہ زوال ہیں۔منتشر ہیں۔افراتفری کا شکار ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے دینی پابندی کو زندگی کے ہر مرحلہ میں اپنے لئے لازم نہیں قرار دیا ہے۔جب تک یہ چھوٹ باقی رہے گی خرابیوں کا دریا چڑھتا ہی رہے گا۔اگر خرابیوں کا علاج کرنا ہے تو ایک ایک فرد کو پابندی دین کی تلقین کی مہم شروع ہو۔ہر چھوٹے بڑے مجمع میں پابندی دین کا چرچا ہو ہر نثر و نظم میں پابندی دین کی دعوت ہو۔دیندار بنو اور دیندار بناؤ کی مہم ہر سطح پر ہر ذریعہ اور تدبیر سے چلائی جائے تو انشاء اللہ ایک ایسا دن بھی آجائے گا جب سماج میں دینداری باعزت ہوگا اور بے دین بے عزت ہوگا۔عوام خواص کے پیچھے۔خواص علماء کے پیچھے صف بہ صف کھڑے نظر آئیں گے اور پورا قافلہ مکمل دینداری کی منزل کی طرف رواں دواں نظر آئے گا۔اور دینی پابندی کا سب سے بڑا سہارا دیندار سماج ہوگا۔اس دیندار سماج کی تعمیر میں ہم سب کو پہلے قطرہ

کی طرح پہل کرنا چاہئے ۔ ہر ایک کو یہ سمجھ کر سفر شروع کر دینا چاہئے کہ ہم اکیلے ہی دینداری کی طرف سفر کر رہے ہیں ۔ کسی کی طرف مڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ سفر شروع کرنے کے بعد مسافر نواز بھی ملیں گے ۔ رفقاء سفر بھی ملیں گے ۔ رہبر بھی ملیں گے ۔ اور جب خدا کی نصرت اور معصومین علیہم السلام کی تائید مل جائے گی تو کیا نہیں ملے گا ۔ خرابیوں کے علاج میں پہلے ہم اپنی خرابیاں پابندی دین کے ذریعہ دور کریں ۔ پھر دوسروں کے علاج کی فکر کریں ۔

لہٰذا آئے ہم سب (دیندار بنو اور دیندار بناؤ) کی مہم شروع کریں ۔ یہی ہماری خرابیوں کا مکمل اور مؤثر علاج ہے ۔

فتنہ قتل سے بھی بدتر

سورہ بقرہ کی آیت ۱۹۱ میں ہے کہ 'فتنہ قتل سے بھی بدتر ہے' اسی سورہ کی آیت ۲۱۷ میں ہے فتنہ قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔ نیز اسی سورہ کی آیت ۱۹۳ میں حکم ہے کہ " اتنا لڑو کہ فتنہ مٹ جائے اور صرف دین خدا باقی رہ جائے" سورہ آل عمران کی آیت ۷ میں ہے کہ " کہ جن لوگوں کے دل ٹیڑھے ہیں وہ ہمیشہ فتنہ پیدا کرنے کے چکر میں رہتے ہیں۔ اور ہمیشہ غیر واضح آیات کے غلط۔ سلط معانی بیان کر کے فتنہ پھیلانے میں مصروف رہتے ہیں؟

قرآن مجید میں فتنہ گروں کی شدید مذمت کی گئی ہے۔ مندرجہ بالا جن آیات کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ ان سے واضح ہوتا ہے۔ کہ

قتل جو قانون ومعاشرہ واخلاق سب کی نظر میں بدترین گناہ ہے فتنہ اس سے بھی بدتر اور بڑا گناہ ہے۔ لیکن لوگ قتل سے ڈرتے ہیں کیونکہ حکومت پکڑے گی۔ سزا دے گی۔ لیکن فتنہ کرنے سے نہیں ڈرتے ہیں کیونکہ فتنہ گر پر دنیا کی حکومتیں مقدمہ نہیں چلاتی ہیں۔ اور آخرت کے مقدمہ کی ابھی کسی کو فکر نہیں ہے۔ جبکہ حقیقی عدالت حقیقی انصاف اور حقیقی عذاب آخرت میں ہی سامنے آنے والا ہے۔ قرآن مجید کے بیان کی تصدیق ہماری پوری زندگی کرتی ہے ہم دیکھتے ہیں کہ قتل کے اثرات محدود ہوتے ہیں اور فتنہ کے اثرات غیر محدود ہوتے ہیں۔ قتل سے فتنہ نہیں پیدا ہوتا بلکہ فتنہ قتل کا باعث ہوتا ہے۔

فتنہ زندگیوں کو زندہ در گور کر دیتا ہے - فتنہ خودکشی پر اور کردار کشی پر آمادہ کر دیتا ہے - اگر ایک قتل ہو جائے تو ساری دنیا افسوس کرتی ہے مگر ہزاروں فتنوں پر بھی کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی - ایک شخص کے خلاف فتنہ ایک آدمی کا قتل ہے - ایک خاندان کے خلاف فتنہ پیدا کرنا پورے خاندان کو قتل کرنا ہے - ایک ادارے ایک انجمن - ایک جماعت کے خلاف فتنہ پیدا کرنا پوری جماعت و ادارہ کا خون کرنا ہے - قوم میں فتنہ پیدا کرنا پوری قوم کا قتل عام کرنا ہے - اور بین الاقوامی فتنے پیدا کرنا عالمی قتل و خون کی ہولی کھیلنا ہے -

مگر افسوس کہ فتنہ گری کا عصری نام سیاست ہے - اور مگروہ سنگدل و جلاد سیاست آج ہر رنگ میں پائی جاتی ہے - خاندانی افراد کا پیدائشی حق ہے کہ وہ عوام میں فتنہ پیدا کرتے رہیں تاکہ ان کا خاندانی وقار باقی رہے - جماعتی سربراہوں کا پیشہ ہے کہ وہ قومی فتنے پیدا کرتے رہیں تاکہ جماعت زندہ رہے - اور ان فنڈ اور ووٹ ملتے رہیں - صاحبان حکومت و اقتدار کی زندگی کا تو دارومدار اسی پر ہے کہ فتنے زندہ رہیں - قلم و زبان - تقریر و تحریر - شعر و سخن فکر و عمل - یونیورسٹی اور جامعہ - اسٹیج اور ممبر - خانقاہ و مسجد غرضکہ ہر زندگی بخش ذریعہ کو آج فتنہ گری کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے - مستکبرین مستضعفین کا خون چوس رہے ہیں مگر ان اژدہوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ عصاء موسیٰؑ اسلامی انقلاب کی شکل میں ظہور پذیر ہو چکا ہے - جہالت کے تودے خاکستر ہو رہے ہیں - علم کی تجلیاں عوام و خواص کو بیدار کر رہی ہیں اور وہ دن دور نہیں ہے جب ہر چودھری کی ہر پگڑی - شاہوں کے تاجوں کی طرح ذلت رسوائی نکبت کی ٹھوکروں میں آجائے -

قرآن مجید نے فتنہ اور دین کو ایک دوسرے کی ضد قرار دیا ہے -

لہٰذا دین اور فتنے جمع نہیں ہو سکتے ۔ دین کی زندگی فتنوں کی موت ہے اور فتنوں کو باقی رہنا دین کو بے نشان کرتا ہے ۔ قرآن مجید نے حکم دیا ہے کہ ہر فتنہ سے لڑو چاہے وہ کسی روپ ظاہر ہو ۔ کسی لباس میں ظاہر ہو ۔ کسی شخصیت میں ظاہر ہو ۔ تاریخ اسلام گواہ ہے کہ فتنے قرآن مجید کے نام پر بلند کئے گئے ۔ دین کے نام پر پھیلائے گئے ۔ جب کبھی دین کو خطرہ میں بتایا گیا ہے تو درحقیقت فتنہ کو خطرہ محسوس ہوا ہے اور اس نے اپنے تحفظ کے لئے دین کا نام استعمال کیا ہے ۔

قرآن مجید نے یہ بھی تبلا دیا ہے کہ فتنہ خور ۔ فتنہ گر ۔ فتنہ ساز ہمیشہ غلط سلط معانی بیان کرتے ہیں ۔ غلط تاویلیں گڈھتے ہیں ۔ کج فکر ٹیڑھے ہمیشہ حقائق کی روشنی سے چوندھیا کر شبہات کے سایہ میں پناہ لیتے ہیں ۔ کل بھی یہی ہوتا تھا ۔ آج بھی یہی ہو رہا ہے کل بھی فتنوں کا علاج علم تھا علمی مرکز کا قیام تھا ۔ علم کی توسیع تھی ۔ آج بھی جھوٹ ۔ افترا ۔ الزام ۔ بہتان جو فتنوں کے ہاتھ پیر ہیں ان کو کاٹ ڈالنے کا ذریعہ یہی ہے کہ ہر شخص کو احکام شریعت سے واقف کرایا جائے ۔ ہر شخص کو حکم شریعت کے سامنے جھکنے کی عادت ڈلوائی جائے ۔ آج کے عہد میں فقیہ کا وجود ۔ اعلم کی تقلید ہر فتنہ کی جڑ کاٹنے کے لئے کافی ہے ۔ فتنے گھریلو ہوں یا خاندانی ۔ جماعتی ہوں یا انفرادی مالی ہوں یا سیاسی ۔ دینی ہوں یا دنیاوی ۔ سب کی موت ہے رواج تقلید تاکہ نہ کسی کی رائے رائے رہے نہ کسی کا خیال خیال رہے ۔ نہ کسی کی سازش زندہ رہے ۔ نہ کسی کی موشگافی کی گنجائش رہے ۔ بلکہ سب شریعت کے سامنے سپر انداختہ ہو جائیں ۔ شریعت کہتی ہے کہ مسلمان کے عمل کو صحیح سمجھو اس کی نیت پر شبہ نہ کرو ۔ نیت پر حملہ کرنا حرام ہے ۔ اگر کوئی بات سننے میں آئے تو حتی الامکان اس کے صحیح معنی پیدا کرنے کی کوشش کرو ۔ پھر بھی دل

کی خلش نہ مٹے تو سب سے پہلے صاحب معاملہ سے پوچھ لو ۔ اگر اب بھی شبہ رہے تو اپنے خیال اور صاحب معاملہ کے عمل کو اعلم کے فتوی اور فقیہ کے فیصلے کی روشنی میں دیکھ کر معاملہ کو طے کرو ۔ جب عمل مسلم پر بدگمانی حرام ہے تو کسی مومن کے عقیدے پر حملہ کرنا تو عظیم گناہ ہے اس کی آبرو کو صدمہ پہنچانا اس کو قتل کرنا ہے بدگمانی فتنہ کی ماں ہے ۔ حسن ظن ہر فتنہ کی قبر ہے ۔ کاش ہم گھروں میں اداروں میں مجمع میں مومن سے سوءِ ظن کو حرام اور حسن ظن کو واجب سمجھ لیتے تو فتنے مر جاتے اور کردار کا قتل عام ختم ہو جاتا ۔ اگر ہم کو قرآن پر یقین و ایمان ہے تو اس کی صدائے مسلسل قلب مومن و دماغ متقی کو لرزہ براندام کرنے کے لئے کافی ہے کہ فتنہ قتل سے بھی بدتر ہے ۔

لہٰذا مسلمان و مومن کا فریضہ ہے کہ وہ فتنہ کے مقابلہ پر ہمیشہ ڈٹا رہے اور فتنہ کوئی بھی شکل اختیار کرے اس کا مقابلہ کرے ۔ فتنہ دولت وحکومت و شہرت ۔ عورت ۔ مرد ۔ بچّہ ۔ بوڑھا ۔ جوان ۔ امیر ۔ غریب ۔ شاعر ۔ ادیب عالم ۔ مصنف ۔ مقرر سب کی صورت میں سامنے آتا ہے ۔

کھلے فتنوں کو پہچاننا آسان ہوتا ہے لیکن ڈھکے چھپے ۔ پرپیچ و خم فتنوں کو پہچاننا بھی مشکل ہوتا ہے ۔ شیطان نے انسانوں کو کھلے فتنوں کا عاشق و شیدا بنا دیا ہے تو ڈھکے چھپے فتنوں سے کون بچنے کی فکر کرے گا ۔ البتہ فتنہ کو جڑ سے مٹانے کی فکر خدا کو ہے ۔ نبیؐ کو تھی ۔ امامؑ کو ہے ۔ اور صالح علماء اور باعمل مومنین اس کے لئے فکرمند تھے اور فکرمند ہیں اور رہیں گے ۔ فتنہ گر ہمیشہ نیک مومنین پر الزام تراشی کرتے رہیں گے تاکہ بدنامی ان کی ہمت کو شکستہ کر دے ۔

فتنہ کا علاج ہے فتنہ گر سے عدم تعاون اور بائی کاٹ کرنا ایسی محفلوں اور بزموں سے اٹھ جانا جہاں ایسے شیطانی تذکرے ہو رہے ہوں ۔ایسے تذکروں کے سننے سے انکار کرنا ۔اور ایسے تذکرہ کرنے والوں کی ہمت شکنی کرنا کسی مومن کی عزت پر حملہ کرنے والا ظالم ہے اور ظالم سے ہر ممکن بیزاری واجب ہے ۔ظلم پر رضامندی بدترین گناہ ہے ۔صرف ظلم پر خاموش رہنا بھی ناقابل معافی گناہ ہے مگر خاموش رہنے والا توبہ کئے بغیر مر جائے ۔

قوم کی گاڑی دین کی پٹڑی پر کیسے چڑھے

ہر انسان کا عمل اس کی فکر اور خیال کا تابع ہوتا ہے۔ عقیدہ عمل کا محرک ہوتا۔ اور عمل عقیدہ کی عکاسی کرتا ہے۔ ہمارا سماج رواج کے پہاڑ تلے دبا پڑا کراہ رہا ہے۔ لیکن ہم ہیں رواج سے لڑنے کا جب تک رواج نہ ہوجائے گا ہمارے مصائب کا خاتمہ نہیں ہوسکتا۔ مگر کوئی چلن بھی رکتے رکتے رکتا ہے اور کوئی نیا رواج رفتہ رفتہ ہی رائج ہوتا ہے۔ درمیانی دور جو عبوری دور ہوتا ہے۔ زیادہ مشکل اور پریشان کن ہوتا ہے۔

آج ہم اسی عبوری دور سے گذر رہے ہیں۔ علماء۔ ذاکرین۔ اعیان عوام غرض سب کو تھوڑا بہت اس بات کا احساس ہے کہ ہم راستے سے ہٹ گئے ہیں۔ سب کو فکر ہے کہ قوم کی گاڑی جو دین کی پٹڑی سے اتر گئی ہے وہ پھر پٹڑی پر آجائے۔ کچھ سوچ رہے ہیں۔ کچھ بول رہے ہیں۔ کچھ اصلاحی اقدامات شروع کر چکے ہیں۔ لیکن ابھی ہوا چوبائی ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ایک اڈوکیٹ مع اپنے ایجوکیٹڈ رفیق سے یہ پوچھ رہے تھے کہ جدید کلمہ صحیح ہے یا قدیم کلمہ۔ وضاحت چاہنے پر بتایا کہ پہلے کلمہ علی ولی اللہ پر ختم ہوتا تھا اب ایران میں محمد رسول اللہ پر ختم کردیا گیا ہے

ان کو سمجھانے کی کوشش ناکام رہی۔ کیونکہ وہ صرف بولنے پر تیار تھے۔ سمجھنے پر آمادہ نہ تھے۔ حالانکہ ان کے انداز فکر کے مطابق علی ولی اللہ پر بھی کلمہ نا تمام رہے گا کیونکہ باقی اماموں کا ذکر کلمہ میں نہیں ہے۔ اسی لئے ایران وعراق وغیرہ میں حضرت علیؑ کے نام کے بعد واولادہ المعصومین حجج اللہ کہا جاتا ہے یعنی حضرت علیؑ اوران کی معصوم اولاد حجت خدا ہیں۔ مگر اس کے بعد بھی کلمہ پورا نہ ہوگا کیونکہ امامت کے بعد قیامت کا عقیدہ بھی ہم رکھتے ہیں۔

تصویر کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ جب حضورؐ نے تبلیغ شروع کی ہے تو صرف لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کہنے کی دعوت دیتے تھے۔ تو کہا اس وقت کلمہ اور زیادہ ناقص تھا۔ نہیں کلمہ اظہار ایمان کا ایک ذریعہ اور نشان ہے نہ کہ ایمانیات کی پوری فہرست ہے۔ حضورؐ کا فرمانا کہ لا الہ الا اللہ کہو درست تھا۔ کیونکہ اللہ کو ماننے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ جو کچھ منوائے گا اسے ماننا ہوگا۔ اقرار توحید درحقیقت پورے دین اور شریعت کا اقرار ہے۔ اسی طرح اقرار رسالت کا مطلب یہی ہے کہ پیغمبرؐ جو کچھ لاتے ہیں سب پر ایمان لانا ہے اقرار امامت کا مطلب بھی یہی ہے کہ حضرت علیؑ اور امامؑ کا ہر فرمان تسلیم ہے۔ آج رات دن ایران میں یہ نعرہ گونج رہا ہے کہ انقلاب مہدیؑ تک اسلامی انقلاب اور خمینی کی حفاظت فرما۔

ایران کے در و دیوار اس نعرہ سے اٹے پڑے ہیں۔ مگر ایڈوکیٹ کیسے قائل ہوسکتا ہے۔ سچ ہو یا جھوٹ اپنی بات منوانا ان کا پیشہ ہے۔ اسی کی روٹی کھاتے ہیں۔ ایجوکیٹڈ اپنی لاعلمی کا اقرار کیسے کر سکتے ہیں یہ واقعہ بطور مثال پیش کیا گیا۔ آج اصلاح کی راہ میں اپنی بات منوانے کا جذبہ ہی سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور اس رکاوٹ کے دور کرنے کا

صرف ایک ہی ذریعہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص صرف خدا کی بات مانے۔ کوئی کسی کو اپنی بات منوا لے۔

اس بات کے مان لینے کے بعد یہ ضرورت خود بخود سامنے آجاتی ہے کہ ہر شخص کو خدا کی بات کیسے معلوم ہو۔ خدا کی بات قرآن مجید میں ہے۔ خدا کی بات معصومین علیہم السلام کی حدیثوں میں ہے تقریباً چھ ہزار قرآن مجید کی آیتیں ہیں اور لگ بھگ چالیس ہزار حدیثیں ہیں۔ قرآن مجید واحادیث میں مجاز و حقیقت۔ ناسخ و منسوخ۔ مقید و مطلق وغیرہ سب ہی کچھ سمجھنے۔ یاد رکھنے کی باتیں ہیں۔ ان کے علاوہ احادیث کے راوی الگ عظیم مسئلہ ہیں۔ عوام کیا۔ خواص و ذاکرین۔ پیش نماز و عربی مدرسوں کے مدرس اور پرنسپل حضرات بلکہ عموماً علمائے کرام بھی قرآن و حدیث سے حکم خدا معلوم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ صرف وہ علماء جو فقیہ کی منزل تک پہنچ جاتے ہیں وہی حکم خدا معلوم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور یہ صلاحیت ۲۵ - ۳۰ سال تک مسلسل محنت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

عوام اور خواص علماء و ذاکرین۔ مدرسین و پیش نماز حضرات سب ہی فقیہ سے حکم خدا معلوم کرتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں جس کا نام تقلید ہے۔ فقیہوں میں جو سب سے زیادہ علم رکھنے والا اور مستند کردار کا مالک ہوتا ہے اس اعلم فقیہ کی تقلید کی جاتی ہے۔ لہٰذا ہم سب کے لئے حکم معلوم کرنا بے حد آسان ہے اپنی عقل و فہم کو بے جا تکان دینے کے بجائے اعلم سے فتویٰ حاصل کریں اور انتشار فکری و بے عملی و بدعملی سے اپنے کو بچائیں۔

فقیہ کو حکم خدا معلوم کرنے میں کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ اس کو فیصلہ کرتے وقت کتنی زحمتوں کا سامنا ہوتا ہے اس کو فقیہ ہی جانتا ہے یا وہ لوگ

جانتے ہیں جو علم و عمل میں فقیہ سے قریب ہوتے ہیں فقیہ ہر وقت اپنے کو خدا کے سامنے حاضر سمجھتا ہے وہ ہر وقت اپنے کو دوزخ کے کنارے کھڑا پاتا ہے۔ غلط فیصلہ معاف ہے لیکن بے جا فیصلہ کرنا معاف نہیں ہے۔ آقائے حکیم اعلی اللہ مقامہ کا فیصلہ تھا کہ زمانہ غیبت امام علیہ السلام میں جمعہ کی نماز خدا کو مطلوب نہیں ہے لہذا اگر کوئی شخص پڑھنا چاہتا ہے تو قربت الی اللہ کی نیت سے نہیں پڑھ سکتا۔ اس لئے نیت قربت اسی وقت ہو سکتی ہے جب حکم خدا کی تعمیل میں وہ کام کیا جائے لیکن جب حکم نماز جمعہ زمانہ غیبت میں نہیں ہے تو تعمیل کس حکم کی ہوگی۔ البتہ اگر کوئی شخص پڑھنا چاہتا تو اس نیت سے پڑھے کہ شاید حکم خدا ہو۔ رجاء مطلوبیت کا یہی مطلب ہے۔ ہم آپ سب ایسے مواقع پر بڑی آسانی سے فیصلہ کر دیتے کہ نماز ہی تو ہے پڑھ لینے میں کیا حرج ہے۔ اور ہم سب روزانہ ایسے بے شمار فیصلے کرتے ہیں اور جو دین نہیں اسے دین قرار دیتے ہیں لیکن فقیہ ایسا نہیں کر سکتا۔ ہمارے فقیہ والا نہ علم ہے نہ دین ہے۔ نہ کردار ہے۔ نہ ہم کو حکم خدا طے کرنے کا حق ہے۔ سارا فساد اسی بات کا ہے کہ ہم خود حکم خدا طے کرتے ہیں۔ اس بری عادت کے خلاف بھرپور علمی مہم چلنا چاہئے تاکہ صرف فقیہ کے فتوی پر عمل کا مزاج پیدا ہو اور قوم کی گاڑی پھر دین کی پٹری پر واپس آجائے۔ اس مہم کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ ہر گھر میں کم از کم توضیح المسائل پڑھی اور سمجھی جائے اور ذاکرین وعلماء و پیش نماز حضرات مومنین کو مسئلہ تقلید مکمل طور پر سمجھائیں اور سمجھانے کے بعد جانچ لیں کہ مومنین صحیح طور پر سمجھ گئے یا نہیں۔

خدا کی پسند معیار عمل نہ کہ مقدار عمل

معیار و مقدار۔ کوالیٹی اور کوانٹیٹی دونوں کی ضرورت اور اہمیت اپنی اپنی جگہ پر ہوتی ہے مگر معیار اور کوالیٹی کی اہمیت اور ضرورت مقدار اور کوانٹیٹی سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اگرچہ اہل دنیا کی نظر میں اکثر و بیشتر مقدار ہی کی اہمیت ہوتی۔ جس جمہوریت کے گرد آج کی دنیا گردش کر رہی ہے۔ اس میں صرف مقدار کی قیمت ہے۔ معیار اس کی ردی کی ٹوکری میں ہے کم پڑھا بلکہ بے پڑھا حالات کے ہاتھوں پڑھے لکھوں پر حاوی ہو کر حکومت کرتا ہے۔ عقل محکوم کی ہوتی ہے اور نام ان کا ہوتا ہے جو جاہل مگر حاکم ہیں۔

مگر دین میں مقدار کی قیمت نہیں ہے بلکہ معیار کی قیمت ہے۔ اسی لئے مذہب میں نہ جمہورت ہے۔ نہ آمریت ہے نہ شاہی ہے۔ نہ سوشلزم ہے نہ کمیونزم ہے بلکہ الوہیت ہے اور فرد و جماعت کے ہر مفاد کی حمایت و حفاظت کرنے والی شریعت ہے۔ عقائد ہیں اعمال کے نکھار کے لئے۔ اور اعمال ہیں عقائد کے اظہار کے لئے۔ اللہ کے دربار میں عزت صرف پابندی دین اور تقوی کے ہی ذریعہ مل سکتی ہے۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (الحجرات آیت ۱۳) خدا کی نظر میں تم میں صرف وہی زیادہ عزت کا حقدار ہو گا

جو زیادہ متقی اور پابند دین ہوگا۔

جناب حُرؑ کو چند گھنٹہ میں وہی درجہ حاصل ہوگیا جو جناب حبیب نے ساری عمر محبت و اطاعت و پیروی امامؑ کرکے حاصل کیا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ دونوں کے عمل کی تعداد میں فرق ضرور تھا مگر معیار ایک ہوگیا تھا۔ اسی طرح بوڑھے لوگ طویل عمر کے باوجود جنّت میں جو درجہ پائیں گے کمسنی میں مرنے والے افراد بھی اسی درجہ کو حاصل کرلیں گے بشرطیکہ دونوں کے عمل کا معیار ایک ہوگا ایک کو موت نے مہلت نہ دی وہ کمسنی میں انتقال کرگیا اور دوسرے کو زندگی نے موقع دیا کہ وہ زیادہ دنوں تک عبادت خدا کرسکا۔ مگر مقدارِ عمل کے فرق کے باوجود معیارِ عمل کے ایک ہونے کی بنا پر دونوں ایک درجہ جنت میں رہیں گے۔

یزیدؔ کے دربار میں راس الجالوت یہودی عالم اور سفیر روم عیسائی دونوں شہیدوں کے سروں اور قیدیوں کو دیکھ کر پوچھتے ہیں کہ یہ کون لوگ ہیں۔ یزیدؔ نہیں بتانا چاہتا۔ یہ اصرار کرکے پوچھتے ہیں اور جب معلوم ہوجاتا ہے تو دونوں سخت ترین مذمت کرتے ہیں کہ تم نے اپنے نبیؐ کے نواسہ کو قتل کرڈالا جبکہ یہودی عالم کہتا ہے کہ جناب داؤدؑ کی نسل میں تینتیس[۳۳] پینتیس[۳۵] پشتوں کے بعد پیدا ہوا ہوں مگر یہودی میرے قدم کی خاک آنکھوں سے لگاتے ہیں اور سفیر روم نے کہا کہ عیسائی اس گرجے کی سب سے زیادہ عزّت کرتے ہیں جس میں سونے چاندی۔ ہیرے جواہرات کے خول میں جناب عیسیٰؑ کی سواری کے جانور کا سم ہے۔ یہ سن کر یزیدؔ برہم ہوتا ہے اور اس کی زبان سے برجستہ نکلتا ہے کہ اگر تم مسلمان ہوتے تو قتل کردیتا۔ بیشک اسلام اور مسلمان یزیدؔ کی تلوار سے محفوظ نہ تھے صرف غیر اسلام و غیر مسلم ہی کو امان مل سکتی تھی۔

اسی لئے محافظ اسلام نے اس سے جہاد کیا تھا۔

یزیدؑ کے اس جملہ کو سن کر دونوں اپنے موقع پر کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہوتے ہیں اور ان شہیدوں اور قیدیوں کی راہ میں قتل پر تیار ہیں تاکہ تیرے اس فعل شنیع کے خلاف ہمارا احتجاج اور شدید ہو جائے۔ چنانچہ دونوں قتل ہوتے ہیں اور قتل ہونے سے پہلے اعلان کرتے ہیں کہ آج کی رات پیغمبرؐ اسلام نے ہم کو جنت کی بشارت دی تھی۔ جس پر ہم حیرت زدہ تھے مگر اب خواب کی تعبیر دیکھ لی۔ لہذا شہادت کے لئے تیار ہیں موت کے وقت آنکھ بند کریں گے اور جوار نبیؐ اسلام میں آنکھیں کھولیں گے۔ دونوں قتل ہوتے ہی جنت پہنچے جبکہ ان کو وقت نے نہ کسی واجب کو ادا کرنے کا موقع دیا — نہ کسی اور عمل کی مہلت دی۔ نہ شریعت کے

اوامر و نواہی پر عمل کی نوبت آئی۔ مگر چونکہ انھوں حرؑ سے بھی کم مدت میں صرف چند لمحات میں عمل کے معیار کو اس بلند منزل تک پہنچا دیا تھا جس منزل پر کربلا والے فائز تھے لہذا مقدار عمل کی شدید قلت اور معیار عمل کی اعلیٰ ترین بلندی کے باعث یہ بھی جنّت کے اعلیٰ ترین درجہ پر فائز ہو گئے۔

خندق کے دن امیر المومنین علی علیہ السلام کی تلوار کے وار کو دونوں جہاں کی عبادت سے حضورؐ نے عمل کے معیار کی بنا پر ہی افضل قرار دیا تھا اور مقدار عمل کی پستی ہی کا اعلان فرمایا تھا۔

آج سماج میں جہاں بہت سی برائیاں پھیل گئی ہیں ان میں سے ایک بڑی برائی یہ ہے کہ صرف مقدار عمل کی طرف توجہ ہے معیار عمل سے آنکھیں بالکل بند ہیں۔ کیونکہ معیار صرف اسی وقت بلند ہو سکتا ہے جب علم دین حاصل ہو۔ اسی لئے عابد سے عالم افضل ہے اسی لئے خون شہید سے عالم کے

قلم کی روشنائی کا درجہ بلند ہے ۔ لہٰذا معیار عمل کی بلندی کا حصول بغیر علم و واقفیت دین ناممکن ہے ۔ پھر صرف علم بھی کافی نہیں ہے جب تک علم کا اثر نیت عمل اور خود عمل میں نمایاں نہ ہو جائے ۔ دکھاوے کی عبادت اسی لئے ناقابل قبول ہے کہ اس میں روح عمل معیار عمل و قربت الی اللہ نہیں ہے ۔ آج اپنے عمل کی کثرت پر بھروسہ کرنے والے کل محشر میں افسوس کے ساتھ ہاتھ ملتے ہوں گے ۔ لہٰذا اپنی محنت کو بربادی سے بچانے کے لئے دین کی جانکاری حاصل کیجئے جس کا ذریعہ دینی کتب کا مطالعہ ہے اور پابند تقلید ہوتا ہے ۔ لازم ہے کہ سماج کے چلن کو شریعت کی رفتار کا پابند کیا جائے نہ کہ شریعت کی عملی توہین کی جائے اور اس کے احکام کا مضحکہ اڑایا جائے ۔ اگر صرف قرآن مجید کا ترجمہ مطابق تفسیر اہلبیت علیہم السلام پڑھا جائے تو آج مسلمانوں میں جو بھونچال آئے ہوئے ہیں وہ ٹھہر جائیں ۔ اور جو جہالت شریعت پر مسلط ہو گئی ہے اور دین سے ناواقف جس طرح دین پر مسلط ہو گئے ہیں جن کے ہاتھوں دین اور دیندار دونوں بری طرح پریشان ہیں سب کو اس عذاب سے نجات مل جائے ۔ یاد رکھئے ہم نے ہی ان برائیوں اور بروں کو اپنے اوپر مسلط کیا ہے ہم ہی ان کو ٹھکانے لگا سکتے ہیں ۔ تب ہی الٰہی مدد اور معصومین علیہم السلام کی نصرت ہم کو حاصل ہو سکے گی ورنہ ہم اپنے ہاتھوں دین اور دنیا دونوں کو تباہ کرتے رہیں گے ۔



بانی تنظیم خطیب اعظم

مولانا سید غلام عسکری طاب ثراہ

TANZEEMUL MAKATIB

GOLAGANJ LUCKNOW – 226 018 U P (INDIA)

Phone : 91 522 22[illegible]15, Fax : 91 522 2228923

e mail : tanzeem@tanzeem.com